داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول	سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن	صفحات: 360، قیمت 500 روپے
حصہ دوم	سُورۃ آل عمران تا سُورۃ المائدہ	صفحات 326، قیمت 500 روپے
حصہ سوم	سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ	صفحات 331، قیمت 500 روپے
حصہ چہارم	سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف	صفحات 394، قیمت 550 روپے
حصہ پنجم	سُورۃ مریم تا سُورۃ السجدۃ	صفحات 480، قیمت 750 روپے
حصہ ششم	سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات	صفحات 484، قیمت 750 روپے
حصہ ہفتم	سُورۃ قٓ تا سُورۃ الناس	صفحات 560، قیمت 800 روپے

(مکمل سیٹ: 4300 روپے)

مکتبہ خُدام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

شعبان المعظم ۱۴۴۱ھ

اپریل ۲۰۲۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کورونا وائرس: احتیاطی تدابیر اور شرعی نقطۂ نظر

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 69

شمارہ : 4

شعبان المعظم 1441ھ

اپریل 2020ء

فی شمارہ 40/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	400 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: +92 322 4585384

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

کورونا وائرس: احتیاطی تدابیر اور شرعی نقطۂ نظر — حافظ عاکف سعید

حقیقتِ دین — 9

فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بیانُ القرآن — 31

سُورۃُ الدُّخان — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ قرآن حکیم — 44

جہاد کی عظمت واہمیت اور اس کا مقصد — شجاع الدین شیخ

ہماری دعوت — 53

دین اور فریضۂ دینی: سیرتِ مطہرہؐ کی روشنی میں — محمد فہیم

آزادئ نسواں — 67

لڑکیوں کی بغاوت: اسباب وعلاج — ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

توضیح وتنقیح — 81

شرعی سزائیں اور سیکولر دانشوروں کا موقف — محمد ندیم اعوان

انوارِ ہدایت — 90

رحمتِ ربّانی کی وسعت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

کورونا وائرس:

احتیاطی تدابیر اور شرعی نقطہ نظر

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ﴾ (التغابن:۱۱)

﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾﴾ (الحدید)

﴿ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَہُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ (الروم)

﴿وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۰﴾﴾ (الشوریٰ)

رفقائے محترم! ان آیات مبارکہ کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی مصیبت جو آتی ہے وہ بغیر اذنِ رب نہیں آتی‘ اُس کی مشیت کے بغیر نہیں آ سکتی۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ میں اس بات کو مزید واضح فرمایا کہ کوئی بھی مصیبت جو زمین میں یا تمہاری جانوں پر آتی ہے اس کے معرضِ وجود میں آنے سے قبل اس کی پوری تفصیل اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔ اور سورۃ الروم میں فرمایا کہ بحر و بر میں جو فساد برپا ہو گیا ہے یہ لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہے‘ یعنی جیسے ہمارے اعمال ہوتے ہیں اسی کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارے حق میں فیصلے صادر فرماتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے‘ ممکن ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی سے باز آ جائیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ﴿وَیَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ﴾ یعنی یہ آفاتِ ارضی و سماوی ہمارے بعض اعمال کا بدلہ ہے جبکہ ہمارے اکثر گناہوں سے تو وہ

درگزر فرما دیتا ہے۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ ”جب بھی کسی قوم میں بے حیائی اعلانیہ ہونے لگتی ہے تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں نہیں ہوتی تھیں۔“

رفقائے محترم! اس پس منظر میں اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیے تو یہ وبائیں اور بلائیں بحیثیت مجموعی ہماری اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں‘ لہٰذا ان سے نجات کے لیے ہمیں فوری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ توبہ اور استغفار کرنا چاہیے‘ اپنے گناہوں پر گڑگڑا کر معافی مانگنی چاہیے۔

اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰہَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡۢبٍ وَّاَتُوۡبُ اِلَیۡہِ

اور

لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ

کا کثرت سے ورد کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ صبح و شام کے اذکارِ مسنونہ کا اہتمام کیا جائے۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل دعائیں صبح و شام تین تین بار پڑھنا معمول بنا لیں:

(۱) بِسۡمِ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَا یَضُرُّ مَعَ اسۡمِہٖ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

(۲) اَعُوۡذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ

(۳) فَاللّٰہُ خَیۡرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ ہُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ

(۴) اَللّٰھُمَّ عَافِنِیۡ فِیۡ بَدَنِیۡ، اَللّٰھُمَّ عَافِنِیۡ فِیۡ سَمۡعِیۡ، اَللّٰھُمَّ عَافِنِیۡ فِیۡ بَصَرِیۡ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنۡتَ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنَ الۡکُفۡرِ وَالۡفَقۡرِ وَاَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ عَذَابِ الۡقَبۡرِ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنۡتَ

(۵) اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡۤ اَسۡئَلُکَ الۡعَفۡوَ وَالۡعَافِیَۃَ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡۤ اَسۡاَلُکَ الۡعَفۡوَ وَالۡعَافِیَۃَ فِیۡ دِیۡنِیۡ وَدُنۡیَایَ وَاَھۡلِیۡ وَمَالِیۡ، اَللّٰھُمَّ اسۡتُرۡ عَوۡرَاتِیۡ وَاٰمِنۡ رَوۡعَاتِیۡ

توبہ و استغفار‘ اذکارِ مسنونہ اور دوسری مسنون دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ماحولیات کے ماہرین کی جانب سے جن احتیاطی تدابیر کی ہدایت کی گئی ہے ان کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ احتیاطی تدابیر ہوں یا علاج معالجہ کا اہتمام یہ سب سنت کے عین مطابق ہے‘ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ

نے طاعون کی وبا کی صورت میں جہاں یہ وبا پھیلی ہو اس میں باہر سے اس جگہ جانے سے منع فرمایا اور جو لوگ وہاں موجود ہوں انہیں بھی اس جگہ سے باہر نکلنے سے منع فرمایا۔ اسی بنیاد پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام نہ جانے کا فیصلہ فرمایا جب کہ وہ ایک سرکاری دورے پر شام جا رہے تھے اور وہاں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی۔ اس پر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے اعتراض پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ تو یہ اسلام کی تعلیمات ہیں۔ اس ضمن میں اصولی رہنمائی بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے ہمیں عطا فرما دی۔ ایک شخص اپنی اونٹنی کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: کیا میں اسے باندھ دوں یا اللہ پر توکّل کرتے ہوئے کھلا چھوڑ دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((اعقِلْهَا ثُمَّ تَوَكَّلْ)) کہ اسے باندھو اور پھر توکّل کرو۔ یعنی احتیاطی تدابیر اختیار کر کے اللہ پر توکّل اختیار کیا جائے۔ پھر اگر وبائی مرض میں موت آ جائے تو اللہ کی مشیت ہے اور طاعون کی بیماری میں مرنے والے کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہید کہا ہے۔ لیکن یہ پیش نظر رہے کہ وہاں جانے سے منع بھی فرمایا ہے' تو اس حوالے سے جو بھی احتیاطی تدابیر ہیں وہ ضرور اختیار کی جائیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں بلکہ عین اسلامی تعلیمات ہیں۔ البتہ اس کی آڑ میں بعض لوگ اپنے مذموم عزائم پورا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے تاحال پاکستان میں ایسی کوئی صورتِ حال نہیں ہے کہ مساجد میں باجماعت نمازوں سے روکا جائے یا اجتماعاتِ جمعہ پر پابندی عائد کی جائے۔ ہمیں حتی المقدور کوشش کرنا ہوگی کہ مسجدیں آباد رہیں۔ یاد رہے کہ ۷۶۴ ہجری میں جب طاعون کی وبا مصر میں داخل ہوئی تو ہلاکتوں کے انبار لگ گئے۔ پھر لوگوں نے قیام اللیل' روزہ' صدقہ' توبہ اور وعظ کو لازم پکڑا۔ اپنے بچوں اور بیویوں سمیت گھروں کو چھوڑا اور مساجد میں پناہ لی تو بہت فائدہ ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین جگہیں مساجد ہیں''۔ چنانچہ مسجدوں کو آباد کرنے والے دنیوی فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

اس موقع پر میں آپ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرانا چاہوں گا کہ کون نہیں جانتا کہ بھارت ایک عرصے سے کشمیریوں کی جدّوجُہد آزادی کو تشدد اور ریاستی دہشت گردی سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گزشتہ سال ۵/ اگست کو مودی سرکار نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر دی اور کشمیر میں ظلم و ستم اور وحشت و درندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔

کشمیر میں مکمل لاک ڈاؤن کر دیا گیا' دنیا سے اس کے رابطے کو منقطع کر دیا گیا۔ کشمیریوں کی چیخ و پکار کو دنیا میں کسی نے قابل توجہ نہ سمجھا۔ اس لاک ڈاؤن کی وجہ سے کشمیریوں کی بے بسی دیدنی تھی' کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچ رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سامنے آ گیا۔ آج کشمیر کا لاک ڈاؤن کرنے والے اور ان کی بے بسی کا تماشا دیکھنے والے اپنا لاک ڈاؤن خود کر رہے ہیں۔ کشمیریوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتے تھے' آج آپس میں معانقہ ہی نہیں مصافحہ کرنے سے بھی خوف زدہ ہیں۔ سکول' کالج' دفاتر یہاں تک کہ عبادت گاہوں پر تالے لگا کر گھروں میں قید ہو گئے ہیں۔ عیش کدے ہی نہیں' بازار بھی ویران ہو گئے ہیں۔ یورپ نے اسلامی شعائر کو جس بے دردی سے ہدف بنایا اُس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے مذہبی نظریات خاص طور پر اس کی معاشرتی اور سماجی اقدار پر یوں حملہ آور ہوئی ہو۔ یورپ میں مسلمان خواتین کے چہروں سے نقاب نوچے گئے' نقاب اوڑھنے کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا' خواتین کا تمسخر اُڑایا گیا' لیکن آج مغرب کی خواتین ہی نہیں مغرب کے مَردوں کے چہروں پر بھی ماسک چڑھا دیے گئے ہیں حقیقت یہ کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ عبرت کا مقام ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!

حاصلِ کلام یہ کہ یہ وقت اللہ کی طرف رجوع کرنے' توبہ و استغفار کرنے اور اپنی زندگیوں کا رخ صراطِ مستقیم کی جانب پھیرنے کا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مناسب ہوگا کہ ہم توبہ کی منادی کرنے والے بھی بن جائیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بھرپور طور پر انجام دیں۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو عملاً نافذ کر کے اپنے رب کو راضی کر لیں۔ رفقائے تنظیم اسلامی سے خاص طور پر گزارش ہے کہ وہ ''دعوت رجوع الی اللہ'' کو ایک مہم کے طور پر اختیار کریں اور زیادہ سے زیادہ انفرادی رابطوں کے ذریعے لوگوں کو توبہ و انابت اور رجوع و استغفار کی طرف توجہ دلائیں' تاکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی روٹھی ہوئی رحمت ہم سب کے شامل حال ہو جائے۔

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی!

فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

انتظامیہ قرآن کالج نے ۲۸ فروری اور یکم مارچ ۱۹۹۰ء کو دوروزہ ''صلاۃ کیمپ'' کا انعقاد کیا جس میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے دن ''فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت'' اور دوسرے دن ''طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت'' کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ ان میں سے پہلا خطاب قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد کی ترتیب وتسوید کے بعد ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے اور دوسرا خطاب' ان شاء اللہ' آئندہ شمارے میں شائع کر دیا جائے گا۔ (ادارۂ میثاق)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِہٖ وَہُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن)

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمٰن)

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ)

﴿اِنِّیۡ وَجَّہۡتُ وَجۡہِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ (الانعام)

معزز سامعین کرام!

میں سب سے پہلے قرآن کالج کی انتظامیہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے یہ دوروزہ صلاۃ کیمپ منعقد کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآن کالج کی پہلی تقریب ہے جو اس کے مقصدِ قیام کے ساتھ بڑی گہری ہم آہنگی رکھتی ہے۔ پھر یہ کہ جس منظم انداز میں اس پروگرام کو ترتیب دیا گیا ہے' میں اس پر بھی منتظمین کو ہدیۂ تحسین پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ دین کے اہم اور بنیادی موضوعات پر آئندہ بھی اسی طرح کے تربیتی کیمپ منعقد کرتے رہیں گے۔

آج میری گفتگو کا عنوان ہے: ''فلسفۂ دین میں نماز کی اہمیت''۔ اس میں سب سے پہلے تو جہ دلاؤں گا کہ لفظ 'فلسفہ' نہ تو اصلاً عربی کا ہے اور نہ ہی یہ قرآن حکیم کی اصطلاح ہے۔ یہ لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے یونانی ہے اور یہ 'فلاسفی' سے بنا ہے۔ اگرچہ 'فلسفی' آج کل عربی میں استعمال ہوتا ہے اور 'فلاسفہ' اس کی جمع ہے' لیکن واقعتاً یہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اسی کی ایک مثال لفظ 'تصوف' ہے' جو بظاہر تفعل کی وزن پر عربی زبان کا صیغہ معلوم ہوتا ہے' لیکن درحقیقت یہ بھی یونانی الاصل لفظ ہے اور یہ تھیوصوفی (Theosophy) سے بنا ہے' جسے معرب بنا کر عربی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

فلسفہ سے ہم جس علم یا جس شعبہ علم کو مراد لیتے ہیں' قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس کے لیے لفظ 'حکمت' ہے۔ اس کا مادہ 'ح ک م' ہے اور اس کا بنیادی مفہوم وہی ہے جو اس سے مشتق لفظ استحکام کا ہے یعنی کسی شے کا مضبوط ہو جانا' پختہ ہو جانا' قوی ہو جانا۔ ایسی صلاحیت حاصل کر لینا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکے اور اپنے خلاف کسی بھی اقدام پر اپنا دفاع کر سکے۔ یہ ح ک م کے مادے کا اصل مفہوم ہے اور حکمت انسان کے فکر اور اس کے شعور کی پختگی کا نام ہے۔ اس لیے کہ انسان مختلف اعتبارات سے حیوانات سے ممیز ہے اور ان میں سب سے اہم اعتبار یہ ہے کہ یہ حیوانِ عاقل اور حیوانِ ناطق ہے۔ یاد رکھیے کہ نُطق اور عقل کا بڑا گہرا ربط و تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ عقل سے انسان کو شعور حاصل ہوتا ہے اور نُطق کی بنیاد یہی شعور ہے۔ تو انسانی فکر

اورشعور کی پختگی‘ اس کے اندر ایسی صلاحیت کا پیدا ہو جانا کہ وہ حقائق تک رسائی حاصل کر سکے‘ اس میں اتنی قوت پیدا ہونا کہ وہ صحیح رخ پر قائم رہے اور صحیح رخ سے موڑنے والے تمام محرکات کے مقابلے میں اپنا دفاع کر سکے‘ یہ حکمت ہے۔ لہٰذا اب آپ ’’حکمتِ دین میں نماز کی اہمیت‘‘ کے موضوع کو ذہن میں رکھیں اور اس ضمن میں ہمیں یہاں سے ابتدا کرنی چاہیے کہ حکمتِ دین کا سب سے بنیادی مسئلہ کون سا ہے۔

معرفتِ خداوندی اور فطری جذبۂ تشکّر

حکمتِ دین کا سب سے اہم‘ بنیادی اور اوّلین مسئلہ معرفتِ خداوندی ہے کہ انسان اپنے رب کو پہچانے اور رب کو پہچان کر اپنے فطری جذبۂ تشکّر کو اُس کی ذات سے وابستہ کر دے۔ یہ فطری جذبۂ تشکر نہ صرف انسان بلکہ حیوانات کا بھی خاصّہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ کوئی بھلائی کی جائے تو ایک خاص ردِّعمل ان کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے‘ جسے ہم جذبہ شکر یا جذبہ تشکّر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حیوان کے پاس اگرچہ وہ زبان نہیں ہے کہ جس میں وہ اس جذبہ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے محسن کی خدمت میں پیش کر سکے‘ لیکن اگر آپ نے کبھی کسی بھوکے پیاسے حیوان کو کوئی غذا فراہم کی ہو یا پانی پلایا ہو تو اس کی آنکھوں سے یہ جذبہ تشکر اُبلتا ہوا آپ کو محسوس ہوگا۔ یہ گویا فطرت کا تقاضا ہے۔ حیوانات سے بلند تر سطح پر انسان ہے تو فطرتِ انسانی کا بڑا اساسی اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکر ادا کرے۔ جس نے بھی اس کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہو‘ خیر کیا ہو‘ اس کی کوئی احتیاج پوری کی ہو‘ اس کی کوئی ضرورت پوری کی ہو تو وہ اس کا شکر بجالائے۔

مزید یہ کہ جب تک عقلِ انسانی اپنے اصل محسن اور مربّی کو نہیں پہچانتی تو یہ فطری جذبۂ تشکّر یا تو منتشر رہتا ہے یا بھٹکتا رہتا ہے۔ چنانچہ آپ اگر شرک کی ساری تاریخ کا تجزیہ کریں گے تو بات یہی نظر آئے گی کہ اپنے علم وفہم کی کوتاہی کی وجہ سے لوگوں نے اس جذبۂ تشکّر کو مختلف اشیاء یا مظاہرِ قدرت کے ساتھ منسلک کر لیا۔ مثلاً یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ دنیا کے سارے نظام میں سورج کی حرارت کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔ ہمارے پاس موجود ساری توانائیوں کی اصل بنیاد اور ذریعہ شمسی توانائی ہی ہے۔ اگر آپ لکڑی جلا کر آگ کے

ذریعے سے حرارت حاصل کرتے ہیں تو یہ بھی درحقیقت سورج ہی کی حرارت تھی جو اس لکڑی میں جذب ہوئی اور اس نے وہ صورت اختیار کی۔ اسی طرح سورج کی حرارت ہی فصلوں کے پکنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لہٰذا انسان نے یہ سمجھا کہ ہمارا سب سے بڑا محسن یہ سورج ہی ہے اور نتیجتاً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے‘ اس کو سجدہ کیا‘ اسے معبود بنا لیا۔ اسی پر آپ قیاس کرتے چلے جائیے‘ جس جس چیز کے بارے میں احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ہماری کوئی بھلائی وابستہ ہے تو اس کے سامنے انسان جھک گیا اور اس کے اظہارِ تشکر کے لیے اس نے مختلف مراسمِ عبودیت ایجاد کر لیے۔

حالانکہ عقل انسانی کی اصل معراج یہ ہے کہ وہ اپنے اصل مربی کو پہچانے اور اسے اپنے اصل رب کی معرفت حاصل ہو جائے اور وہ جان لے کہ یہ تمام مظاہرِ فطرت اور مظاہر قدرت‘ جنہیں نظامِ دنیا کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ کیا گیا ہے‘ یہ سب خود کسی اور کی ربوبیت کے مظہر ہیں۔ کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق ہے‘ کوئی اور ہے جس نے ان کے لیے یہ سارا نظام بنایا ہے تو ایک ہی چھلانگ میں انسان وہاں پہنچتا ہے کہ اپنے اصل رب اور مربی کو پہچان کر اپنے پورے جذبۂ تشکّر کو اس کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔

یہ میں نے آپ کے سامنے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی اس پہلی آیت کا خلاصہ عرض کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کے حوالے سے حکمت اور حکمت کے منطقی اور لازمی نتیجہ کو بیان کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾﴾

’’اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر ادا کرو! اور جو کوئی بھی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی بھلے کے لیے۔ اور جو کوئی ناشکری کرتا ہے تو اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے۔‘‘

گویا فطرتِ سلیمہ کا اولین تقاضا اور عقل کی معراج اپنے اصل محسن اور مربی کو پہچان کر اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ اسی کا نام حکمت ہے۔ حکمت‘ عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیمہ کے امتزاج سے

وجود میں آتی ہے جس کا نتیجہ شکرِ رب یا معرفتِ رب ہے۔ یوں سمجھئے کہ حکمتِ دین کا اساسی مسئلہ یہی ہے اور باقی سارے مسائل اب یہیں سے آگے چلیں گے۔

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ آیات کے ذریعے سے انسان کے اندر معرفتِ رب کو جگاتا ہے۔ میں نے جگانے کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ربّ کی معرفت فطرتِ انسانی میں بالقوّہ (potentially) موجود ہے لیکن سوئی ہوئی (dormant) ہے اور انسان کے اندر سوئی ہوئی معرفتِ رب کو جگانے کا بڑا ذریعہ آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی ہیں جبکہ ان سے بھی زیادہ مؤثر ذریعہ آیاتِ قرآنیہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کہیں اپنے آپ کو 'الذکر' کہتا ہے، کہیں 'ذکریٰ' اور کہیں 'تذکرہ'۔ گویا یہ تو صرف یاد دہانی ہے جبکہ معرفت رب تو تمہارے اپنے اندر موجود تھی یا موجود ہے لیکن تمہیں اس کا شعور نہ تھا۔ وہ تمہارے شعور کی سطح پر نہیں آئی تھی یا یہ کہ آئی تھی لیکن پھر تم اسے بھول گئے ہو اور تم پر ذہول کے پردے پڑ گئے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا کہ ع ''کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے''۔ تم گم ہو گئے ہو لہٰذا اس کو اُجاگر اور تازہ کرنے، گمشدگی کے اندھیروں سے نکال کر معرفت کی روشنی میں لانے کے لیے یہ آیاتِ مبارکہ ہیں: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ (الحدید:۹) ''(اللہ ہی) وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ روشن آیات نازل کی ہیں تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔''

حصولِ معرفتِ ربّ کے بعد تین لازمی چیزیں

اب اس سے اگلے مرحلے پر چلتے ہیں جو اس وقت میری گفتگو کا اصل موضوع ہے۔ اس کے لیے یہ تمہید ضروری تھی کہ حکمت قرآن اور حکمت دین کا اوّلین، اہم ترین، سب سے اساسی اور بنیادی مسئلہ معرفتِ رب ہے۔ اگر اس مرحلے کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان طے کر لے بایں طور کہ اسے اللہ کی معرفت بھی حاصل ہو جائے اور اسے ایمان کی نعمت بھی میسر آ جائے تو اب اس کے سامنے تین مسئلے اور ہیں۔ ان کو اچھی طرح سے شناخت (identify) کر لیجیے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ معرفتِ رب سے اس کو جو فکرِ صحیح میسر آئی ہے وہ مزید پیش قدمی کرے۔ یعنی رب کو پہچان لینا تو اس کا starting point تھا اور ابھی اس سے آگے بڑھ کر اس فکرِ صحیح نے بڑی بلندیوں کو چھونا ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں کلمہ طیّبہ کی مثال یوں بیان کی گئی ہے: ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۲۴﴾ (ابراھیم) ''جیسے ایک پاکیزہ درخت، اس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں''۔ چنانچہ فکرِ انسانی کے لیے مضبوط جڑ تو معرفتِ رب ہے لیکن اب یہ فکر ترقی کرے گی، نشوونما پائے گی، آگے بڑھے گی۔ اس کی شاخیں آسمانوں کی بلندیوں کو چھوئیں گی۔ تو سب سے پہلا مسئلہ ہے فکرِ صحیح کی مزید پیش قدمی!

دوسرا مسئلہ ہے عمل کی درستگی، صحیح صحیح عمل۔ یہ انسان کا بہت بنیادی مسئلہ ہے۔ انسان اپنے نفس امارہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مرعوب ہو کر کسی غلط رخ پر نہ پڑ جائے۔ چنانچہ اس کے عمل کو درست رکھنے کے لیے اسے کوئی سہارا درکار ہے۔

تیسرا مسئلہ تو میرے نزدیک اس دَور میں سب سے زیادہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے بہت سے دینی حلقے بھی، خاص طور پر جو Religious Activists شمار ہوتے ہیں، جو دین کی احیائی جدّوجُہد میں مصروف نظر آتے ہیں، تجدید دین، احیائے دین، غلبہ و اقامتِ دین کی بات کرتے ہیں، ان کی بھی بہت بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اس تیسرے گوشے کو تقریباً نظرانداز کر رہے ہیں اور وہ ہے روحانی ترقی۔ انسان کی اصل عظمت کی بنیاد تو وہ روحِ ربانی ہے جو اس میں پھونکی گئی: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:۲۹)۔ اب بڑے سے بڑا عقلیت پسند (rationalist) اور روحانیات کا منکر شخص بھی کم از کم یہ ماننے پر مجبور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی ہے اس میں درحقیقت انسانی روح کی عظمت اور اس کی شرافت، اس کی بلندی اور اس کی بزرگی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال معرفت رب حاصل ہو جانے کے بعد تین چیزیں ضروری ہیں: (۱) فکرِ صحیح کی ترقی (۲) عمل کی درستگی، یعنی اس میں افراط و تفریط نہ ہو اور

انسان نفس امارہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر کوئی غلط اور غیر متوازن راستہ اختیار نہ کرے۔ اور (۳) روحانی ترقی ------ اب ان تینوں چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

(۱) فکرِ صحیح کی ترقّی: فکرِ صحیح کے مزید ارتقاء اور اس کی مزید پیش قدمی کے لیے قرآن حکیم نے سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں ''ذکر'' کو سب سے پہلے اور سب سے اہم عامل کی حیثیت سے شمار کیا ہے۔ چنانچہ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں یہی مضمون آیا ہے: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن اور رات کے اُلٹ پھیر میں نشانیاں ہیں' ہوشمندوں کے لیے!'' ان کے ذریعے سے انسانی شعور کے اندر معرفتِ رب اُجاگر ہوگی۔ گویا اس نے وہ پہلا مرحلہ طے کر لیا' وہ dormant معرفتِ رب activate ہو گئی۔ اب مزید فکر کا مرحلہ ہے جو اگلی آیت میں آیا ہے: ﴿وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اور وہ غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں''۔ لیکن اس تفکّر کے ساتھ ذکر بھی ضروری ہے اور ذکر بھی وہ جو مستقل اور دائم ہو۔ چنانچہ ''اولوا الالباب'' کی صفت بیان کی گئی: ﴿الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ﴾ ''وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل (یعنی لیٹے ہوئے) بھی''۔ اب ان تین کے سوا تو کوئی پوزیشن انسان کی نہیں ہے اور اسی کا نام ہے دوامِ ذکر۔ اس کے ساتھ اگر وہ تفکر کرتے ہیں تو ان کا فکر اگلی منزل تک پہنچتا ہے۔

ذکر و فکر کی ایک دوسرے کے ساتھ لزومیت کو مولانا روم نے بہت ہی سادہ لیکن پُرمغز انداز میں اپنے شعر میں بیان کیا ہے ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن!

یعنی اس قدر تو ہم نے تمہیں بتا دیا' سمجھا دیا' یہ بات تو تمہاری عقل میں آ گئی' اب جاؤ خود

غور و فکر کرو اور مزید آگے پیش قدمی کرو۔ اور اگر فکر میں جمود آ جائے' فکر سست پڑ جائے' تو جاؤ پھر ذکر کرو۔ گویا ذکر اور فکر گاڑی کے دو پہیے ہیں کہ جن سے فکرِ انسانی صحیح رخ پر آگے بڑھے گی۔ اگر یہ ذکر ساتھ نہیں رہے گا تو فکرِ انسانی کج ہو جائے گی اور پھر وہ فکر چاہے کتنی ہی بلندی کو پہنچ جائے لیکن وہ ٹیڑھی ہو گی اور وہ صراطِ مستقیم پر پیش قدمی کرنے والی فکر نہیں ہو گی۔

علامہ اقبال نے مولانا روم کو اپنا 'مرشد' تسلیم کیا ہے اور مولانا روم نے جو فکر اور خیال اپنے درج بالا شعر میں پیش کیا اسی کو علامہ اقبال نے دو اشعار میں مزید شکوہ کے ساتھ اور مزید خوبصورت اور حسین انداز میں پیش کیا ہے: ؎

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصل شہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکرِ را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

یعنی قرآن کے بغیر اگر کوئی شیر بھی ہو تو وہ بھی اصل میں لومڑی ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے' اس لیے کہ اصل شہنشاہی تو فقرِ قرآن ہے اور فقرِ قرآن اختلاطِ ذکر و فکر کا نام ہے۔ گویا فقرِ قرآن اس امتزاج سے وجود میں آتا ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو۔ اور آخری مصرع میں اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے فکر کو کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہوا نہیں پایا جب تک کہ اس کے ساتھ ذکر نہ ہو!

(۲) عمل کی درستگی: دوسری چیز ہے عمل کی درستگی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک گہرے تعلق کی ضرورت ہے۔ صبر کی بحث میں یہ مضامین میں نے کئی بار بیان کیے ہیں کہ جہاں مصیبت اور تکلیف پر صبر ہوتا ہے' وہیں اللہ کے احکام پر جمنا بھی صبر ہے' خواہشاتِ نفس کی باگ کو تھام کر رکھنا بھی صبر ہے اور استقامت یعنی کسی شے پر قائم رہنا بھی صبر کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ عمل صحیح پر استقامت اور اس پر صبر کی سب سے اہم بنیاد اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ اور سہارا تعلق مع اللہ ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا

صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل:۱۲۷) ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے''۔ گویا صبر کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے ساتھ ایک ایسا تعلق برقرار رہے جو نہ صرف گہرا ہو بلکہ قائم و دائم اور مسلسل ہو۔ ذرا سا ذہول ہوگا، تعلق مع اللہ میں ذرا کمی آئے گی تو شیطان کا وار کاری ہو جائے گا۔ اسی کو حضور ﷺ نے حدیث میں تمثیلاً یوں تعبیر کیا ہے کہ اگر قلب یادِ خداوندی سے خالی ہو جائے تو ابلیس لعین اس پر اپنی تھوتھنی لگا کر پھونکیں مارنا شروع کر دیتا ہے۔ فرمایا: ((اِنَّ اِبْلِیْسَ لَهٗ خُرْطُوْمٌ كَخُرْطُوْمِ الْكَلْبِ وَاضِعُهٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ آدَمَ)) (رواہ الدیلمی، بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴) ''کتے کی تھوتھنی کی طرح ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے اور وہ اسے ابنِ آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے''۔ اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے، وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے، تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دے۔ شیطان کو یہ موقع تب ملتا ہے جب انسان کے تعلق مع اللہ میں کمی ہو، یا تو وہ خانہ بالکل خالی ہو گیا ہو یا اتنا کمزور ہو گیا ہو کہ کالعدم ہو جائے۔ اس پر فارسی کا وہ مقولہ بھی ہے کہ ''خانہ خالی را دیو می گیرد!'' کہ اگر گھر خالی رہے تو جنات اس پر آ کر قبضہ جما لیتے ہیں۔ گویا اگر انسان کا دل یادِ الٰہی سے خالی ہو تو اس پر شیطان قبضہ کر لیتا ہے۔

(۳) روحانی ترقی: تیسری چیز ہے روحانی ترقی اور اس کے لیے ہماری دینی اصطلاح ہے: تقرب الی اللہ، یعنی اللہ سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جانا۔ اس پر میرا ایک کتابچہ بھی ہے: ''تقرب الی اللہ کے دو مدارج'' جو درحقیقت ایک حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مبنی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے تقرب الی اللہ کے لیے دو درجے بیان فرمائے، ایک درجہ ہے تقرب بالفرائض یعنی فرائض کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرنا اور دوسرا درجہ ہے تقرب بالنوافل یعنی نوافل کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کرنا۔ ان دونوں درجوں میں کیا نسبت و تناسب ہے اور اہمیت کے اعتبار سے کون بڑھ کر ہے، یہ تمام باتیں میں نے اپنی اس تقریر میں بیان کی تھیں جو اس کتابچے میں شائع ہوئی ہے۔ جن حضرات کو شوق ہو وہ اس کا مطالعہ کریں۔

یہ تقرب کوئی جسمانی یا مادّی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ سے قرب حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ اور ہمارے درمیان کروڑوں میل کا فاصلہ ہے اور اب ہمیں کسی سیڑھی یا رسّی کے ذریعے بڑی محنت اور مشقّت سے اس فاصلے کو ختم کرنا ہے۔ درحقیقت انسان اور اللہ ربّ العزت کے درمیان فصل اور بُعد تو ہے ہی نہیں، جیسے قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶﴾ (قٓ) ''اور ہم تو انسان سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ (الحدید:۴) ''اور وہ تو تمہارے ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو''۔ بس معاملہ یہ ہے کہ تم اور چیزوں میں مشغول و مصروف رہتے ہو، تم ہماری طرف دھیان ہی نہیں دیتے، ہماری طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، راہروِ منزل ہی نہیں!

انسان جب متوجہ ہو جاتا ہے اور روحانی اعتبار سے آگے پیش قدمی کرتا ہے تو یہ درحقیقت تقرب الی اللہ ہے اور اسی کو ہم کہیں گے روحانی ترقی۔

معرفتِ رب کے بعد حکمتِ دین کا اہم ستون: نماز

آگے بڑھنے سے پہلے میری اب تک کی باتوں کی ترتیب کو ذہن میں قائم کیجیے۔ ہم یہاں سے چلے تھے کہ دین کے ساتھ اصل مناسبت فلسفے کی نہیں، حکمت کی ہے اور حکمتِ قرآنی کا پہلا، اہم ترین اور بنیادی مسئلہ معرفتِ رب کا حصول ہے۔ اس کا نتیجہ شکرِ خداوندی ہے اور اس کا ذریعہ آیاتِ آفاقی، آیاتِ انفسی اور سب سے بڑھ کر آیاتِ قرآنیہ ہیں، جو الذکر، ذکریٰ اور تذکرہ ہے۔ اس پہلے مرحلے کو اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے طے کر لے تو اب اس کے سامنے تین مسئلے ہیں: (۱) فکر کی صحیح رخ پر مزید پیش رفت۔ اس کے لیے ذکر اور فکر دونوں کا امتزاج لازمی ہے۔ (۲) عمل کی درستگی۔ نہ افراط و تفریط ہو اور نہ عدم توازن ہو۔ نہ انسان نفس سے مغلوب ہو جائے، نہ جذبات کی رو میں اندھا ہو جائے اور نہ ماحول سے متاثر ہو جائے، بلکہ اس کا عمل صحیح رخ پر ہو۔ اس مرحلے کے لیے

تعلق مع اللہ ضروری ہے‘ جتنا تعلق مع اللہ گہرا ہوگا اتنا ہی عمل درست ہوگا۔ (۳) روحانی ترقی‘ جو اصل حاصل اور اصل مقصود ہے اور اس کے لیے تقرب الی اللہ ضروری ہے۔

اب غور کیجیے کہ ان تینوں چیزوں کا نماز کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اور نماز ان تینوں کے لیے ستون کی حیثیت رکھتی ہے‘ لہٰذا ایمان یا معرفتِ رب کے بعد حکمتِ دین کا اہم ترین مسئلہ نماز ہے‘ اس لیے کہ یہ انسان کو اللہ ربّ العزت کے ساتھ ایک گہرے تعلق کا ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اپنی تمام مصروفیات جن میں گم ہونے کا خدشہ ہوتا ہے‘ ان سے کچھ وقت نکالو۔ ۲۴ گھنٹے کے معمولات میں سے کم سے کم پانچ مرتبہ تو لازماً نکلو اور اپنے آپ کو‘ اپنے حواس اور اپنی باطنی کیفیات کو بھی ذرا تازہ کرو۔ اگر کوئی گندگی‘ نجاست یا کسی اور طرح کی ناپاکی کا کوئی معاملہ ہے تو طہارت حاصل کرو‘ اس لیے کہ طہارت سے تمہاری روح کو بھی بالیدگی حاصل ہوگی‘ تمہارے حواس بھی تازہ ہوں گے‘ گویا بحیثیت کُل تمہاری ہستی چاق و چوبند ہو جائے گی۔ جو بھی کسل‘ سستیاں اور کثافتیں ہیں ان سب سے نجات حاصل کرو اور اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاؤ۔ اس کے ساتھ اپنا عہد بھی تازہ کرو اور اس کی اہم صفات کو بھی اپنے ذہن میں مستحضر کرو۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں جس میں معرفتِ ربّ اور جذبۂ تشکر کا بیان ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک سے روکا گیا ہے اور اسے ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد درمیان میں کچھ اور مضامین آئے اور پھر یہ آیۂ مبارکہ آئی:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (لقمٰن)

’’اے میرے بچے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو بھی تکلیف تمہیں پہنچے اس پر صبر کرو! یقیناً یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔‘‘

گویا اللہ کو محض پہچان لینا کافی نہیں ہے‘ بلکہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ یاد رہے گا تو فکرِ صحیح آگے بڑھے گا اور پھر اس سے تعلق مع اللہ بڑھے گا‘ اور جب اس کے ساتھ ایک گہرا تعلق

قائم ہوگا تو عمل درست رہے گا۔ بالکل یہی بات سورۂ طٰہٰ میں بیان ہوئی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے مکالمہ اور مخاطبہ کا تذکرہ ہے۔ گویا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہونے والی پہلی وحی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء کرام علیہم السلام کے گروہ میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام کیا ہے۔ اگرچہ حجاب کے پیچھے سے گفتگو ہوئی ہے‘ لیکن یہ کہ درمیان میں فرشتے کا واسطہ نہیں تھا۔ براہِ راست اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝﴾ (النساء) ’’اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام فرمایا ہے‘ جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے‘‘۔ اس مکالمہ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝﴾ (طٰہٰ)

یہ آیت مبارکہ حکمت قرآنی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ ’’بے شک میں ہی اللہ ہوں‘ میرے سوا کوئی معبود نہیں‘ پس میری بندگی کرو اور نماز کو قائم کرو میری یاد کے لیے‘‘۔ بلکہ اسی سلسلہ کلام میں —— کافی گفت وشنید کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ معذرت بھی کی‘ کچھ دعائیں بھی کیں اور ان میں سے ایک دعا اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمائی کہ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی کارِ رسالت میں شریک کر دیا۔ اس کے بعد پھر جب فرعون کی طرف جانے کا کہا تو فرمایا: ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝﴾ (طٰہٰ) ’’جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری ان نشانیوں کے ساتھ اور میرے ذکر سے سستی نہ کرنا‘‘۔ یہ جو عظیم مشن تمہارے کندھوں پر آ گیا ہے اور یہ کٹھن فرض جو تم پر عائد ہو گیا ہے‘ اس کے لیے تمہارے پاس قوت کا بڑا ذریعہ نماز ہے‘ لہٰذا میری یاد میں کبھی غفلت نہ کرنا‘ اس میں کبھی کوئی کمی نہ آنے دینا۔ اس لیے کہ اگر وہ تعلق کمزور پڑ جائے یا منقطع ہو جائے (معاذ اللہ!) تو پھر انسان گویا شیطان کے لیے ایک لقمہ تر بن جاتا ہے۔

اب آپ تیسری شے تقرب الی اللہ پر غور کیجیے۔ اس کے حوالے سے میں نے جو فرائض اور نوافل کی بات ہے‘ اس کو اس وقت ذہن سے نکال کر یہ سمجھئے کہ تقرب الی اللہ میں نماز کا کیا مقام ہے۔ اس لیے کہ نماز فرض بھی ہے اور نماز نفل بھی ہے‘ تو وہ ان دونوں

مرحلوں میں شریک رہے گی۔ اب لفظ صلوٰۃ کے حوالے سے ان دونوں چیزوں کو سمجھئے۔ اس کا مادہ ہے: ''ص ل و'' یا ''ص ل ی'' اس لیے کہ حروفِ علّت تو ایک دوسرے سے بدلتے رہتے ہیں۔ خالص عربی زبان میں اس مادہ کا مفہوم ہے: آگ جلانا' آگ تاپنا' آگ سینکنا یعنی حرارت حاصل کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہنم کے ذکر میں اِصْلَوْھَا' یَصْلَوْنَھَا' تَصْلٰی نَارًا وغیرہ جیسے الفاظ بار بار آتے ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے کلام میں تَصْطَلُوْنَ کا لفظ آیا ہے۔ جب وہ آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے اہل خانہ سے یہی کہا تھا: ﴿سَاٰتِیْکُمْ مِّنْھَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْکُمْ بِشِھَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷﴾ (النمل) ''میں وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آؤں گا' یا کوئی دہکتا ہوا انگارہ لے آؤں گا تاکہ تم (آگ) تاپ سکو'' — تَصْطَلُوْنَ درحقیقت باب افتعال ہے اور ت یہاں پر ص کی وجہ سے ط کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

بہرحال اس مادہ کا بنیادی مفہوم ہے: تاپنا' سکائی اور حرارت حاصل کرنا۔ اس کے حوالے سے سمجھ لیجیے کہ نماز کا بنیادی تعلق روح کے ساتھ ہے۔ روح میں محبت خداوندی کی آگ اگر ٹھنڈی پڑ گئی ہو یا اس میں کمی ہو رہی ہو تو اس کو ازسرِنو چارج کرنا' جیسے بیٹری کو recharge کیا جاتا ہے' اسی طرح روح کے اندر محبتِ خداوندی کی اس حرارت کو ازسرنو تازہ کرنا' یہ ہے درحقیقت نماز کا اصل مقصد۔ اس لیے کہ اس لفظ کا اصل لغوی مفہوم یہی ہے۔ اگرچہ لفظ صلوٰۃ سب سے زیادہ جس معنی میں استعمال ہوتا ہے' وہ ہے اقدام کہ کسی کی طرف متوجہ ہونا اور پھر دعا۔ صلوٰۃ کا سب سے قریبی لفظی مفہوم دعا ہے یعنی کسی کی طرف توجہ کرنا' مناجات کرنا' گفتگو کرنا' مخاطبہ' مکالمہ۔ دعا درحقیقت صلوٰۃ کا سب سے بڑا اصطلاحی مفہوم ہے' لیکن اس کے مادہ کا اصل مفہوم ہے تاپنا' حرارت حاصل کرنا۔ ان دونوں کے حوالے سے عرض کر رہا ہوں کہ وہ تاپنا اور حرارت حاصل کرنا روح کے اعتبار سے ہے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ: ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

یہ عشق کی آگ جب بجھ جاتی ہے تو درحقیقت یہی انسان کی روحانی موت ہے۔ مجھے اقبال کا ایک اور شعر یاد آیا۔ اقبال نے انسانِ محکوم اور انسانِ حُر یعنی غلام اور آزاد انسان کی نفسیات کے بنیادی فرق کو یوں بیان کیا ہے ؎

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک!

یعنی انسان منطق کی دلیلوں میں چالاک ہو جائے' لغت ہائے حجازی کا ایک خزانہ جمع کر لے کہ اسے تمام الفاظ کے معانی یاد ہوں' فقہ کے بڑے بڑے مسائل اسے ازبر ہوں' بے انتہا جزئیات مستحضر ہوں' فلسفے کے بڑے بڑے مسئلے اس نے حل کر لیے ہوں' لیکن اگر روح میں اللہ کی محبت کی آگ نہیں ہے' وہ تپش نہیں ہے تو وہ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

اسی کے حوالے سے آج مجھے یاد آیا تھا کہ علامہ اقبال کی جو بڑی سادہ سی ایک نظم ہے: ''یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے'' اس میں جو الفاظ آئے ہیں ''جو روح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے'' یہ ہے نماز کا اصل مقصود اور یہی وہ چیز ہے جو آج نگاہوں سے اوجھل ہے۔ یہ پہلو سامنے ہے ہی نہیں۔ اس کا دوسرا پہلو سامنے ہے اور وہ بھی میرے نزدیک بہت اہم اور بہت بنیادی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں' لیکن یہ ہے بلندترین منزل کہ نماز تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اور یہ اس لیے درکار ہے کہ روح کے اندر عشق کی حرارت اور گرمی تازہ ہو جائے۔ بسا اوقات یہ اندر دب جاتی ہے جیسے آگ کے انگارے کے اوپر راکھ آ جاتی ہے — ع ''آگ دبی ہوئی سمجھ' آگ بجھی ہوئی نہ جان!'' — اس دبی ہوئی آگ کو پھر ایک شعلہ بنانا' پھر اس کے اندر ایک حیاتِ تازہ پیدا کرنا' یہ ہے نماز کا اہم ترین اور بلندترین مقصد۔

ذکر خطابی کی بلندترین شکل: نماز

ذکر کا اصل مفہوم ہے: استحضار اللہ فی القلب۔ ہمارے ہاں ذرائع ذکر کو بھی غلطی سے ذکر قرار دے دیا گیا ہے۔ جیسے نماز ذکر نہیں ہے' بلکہ ذکر کا ذریعہ ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝۱۴﴾ ''اور نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے''۔ یہ اللہ اللہ کہنا' سبحان اللہ' الحمد للہ کا

ورد/ادعیہ ماثورہ‘ حضورﷺ کی مسنون دعائیں جنہیں انسان اپنے معمولاتِ دنیاوی کے ساتھ پڑھتا رہتا ہے‘ یہ تمام ذرائع ذکر ہیں۔ حقیقت میں ذکر ہے استحضار اللہ فی القلب یعنی اللہ کو دل میں لے آنا۔

اب اس کے حوالے سے ذرا بات سمجھ لیجیے۔ ایک تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ’’الذکر‘‘ یعنی مجسّم ذکر تو قرآن ہے۔ لہٰذا ذکر کی فہرست جب آپ مرتّب کریں گے تو ان میں سب سے پہلے قرآن آئے گا‘ اس لیے کہ وہ ہماری حکمت کے پہلے مسئلے کو حل کر رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر ’ذکر‘ کی مختلف صورتیں اور اس کے لیے کچھ اصطلاحات ہیں جن کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

ایک ذکر غیابی ہے یعنی صیغہ غائب میں اللہ کو یاد کرنا‘ مثلاً اللہ اکبر‘ اللہ اکبر کہنا۔ اللہ اکبر جملہ اسمیہ خبریہ ہے اور آپ ایک حقیقت کی تکرار کر رہے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے‘ اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ درحقیقت ذکر غیابی ہے کہ آپ اس میں اللہ سے مخاطب نہیں۔ ایک ذکر خطابی یا ذکر حضوری ہوتا ہے جس میں مکالمہ اور گفتگو ہوتی ہے۔ نماز درحقیقت ذکر حضوری اور ذکر خطابی کی بلند ترین شکل ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ نماز یا صلوٰۃ کے اکثر و بیشتر جو اصطلاحی معنی کیے جاتے ہیں وہ ہے دعا اور دعا میں مکالمہ اور مخاطبہ ہی ہوتا ہے۔ اے اللہ! اے میرے رب! اے میرے پروردگار! پھر نماز اور صلوٰۃ کا لفظ اقدام اور کسی کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بھی مستعمل ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ یعنی نماز شروع کرنے کے لیے ایک تو وہ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں آئے ہیں: ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۹﴾﴾ (الانعام) ’’میں نے تو اپنا رُخ کر لیا ہے یکسو ہو کر اُس ہستی کی طرف جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں‘‘۔ یہ ہے توجہ کا ارتکاز‘ بشرطیکہ یہ صرف الفاظ ہی نہ ہوں‘ بلکہ واقعتاً انسان کی یہ نفسیاتی کیفیت ہو کہ شعوری طور پر وہ فیصلہ کر رہا ہو کہ اب میں منقطع ہو رہا ہوں۔ ہر طرف سے اپنی توجہ کو ہٹا کر‘ اپنے آپ کو خالی الذہن کر کے یعنی ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے میں اپنی توجہ کا ارتکاز کر رہا ہوں اُس ذاتِ

اقدس کی طرف جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور بالکل یکسو ہو کر کر رہا ہوں۔

دوسری وہ دعا ہے جس سے ہم اپنی نماز کا افتتاح کرتے ہیں۔ دیکھیں اس میں خطاب کا کس قدر اہتمام ہے: سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ ’’پاک ہے تو اے ہمارے رب!‘‘ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ۔ یہ ہے تخاطب‘ براہِ راست مخاطب ہونا۔ یہ گویا میں آپ کے سامنے علامہ اقبال کے خطبے کا لُبِ لُباب عرض کر رہا ہوں۔ ان کے مشہور خطبات میں غالباً تیسرا یا چوتھا لیکچر ہے: ’’The meaning of prayer in Islam‘‘۔ اس میں تصور یہ دیا گیا ہے کہ دو ہی انائیں ہیں۔ ایک انائے کبیر ﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا﴾ یہ وہ انائے کبیر‘ انائے مطلق ہے‘ جس کو علامہ اقبال نے کہا: The Big I Am۔ اس انائے کبیر کا بیان سورۂ طٰہٰ کی درج بالا آیت میں ہے اور میرے علم کی حد تک قرآن حکیم کا کوئی اور مقام نہیں ہے جس میں اللہ ربّ العزت نے اپنی انانیت کبریٰ اور انانیت مطلقہ کا اظہار اس قدر بلند آہنگ کے ساتھ کیا ہو۔ چنانچہ ایک طرف وہ انائے کبیر ہے اور ایک طرف یہ انائے صغیر‘ انائے محدود‘ چھوٹی سی ایک انا ہے۔ آپ جب کہتے ہیں ’’میں‘‘ تو بڑی محدود سی ایک انا ہے۔ گویا ایک طرف finite ego اور دوسری طرف Infinite Ego ہے‘ اور صلوٰۃ اصل میں اس چھوٹی انا کا بڑی انا کے سامنے آ کر‘ روبرو ہو کر خطاب ہے۔ ایک ہے صیغہ غائب میں تکرار یعنی سبحان اللہ‘ الحمد للہ‘ اللہ اکبر کا ورد! وہ بھی بہت اہم ہے اور اس کا اپنی جگہ پر فائدہ ہے‘ لیکن ہر شے کے درجے ہیں۔ اور اگر آپ ان درجوں کا لحاظ نہیں کریں گے تو غلط رخ پر پڑ جائیں گے۔ ع ’’گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!‘‘

چنانچہ نماز اصل میں ذکر خطابی اور ذکر حضوری کی بلند ترین شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ میں کَ کی تکرار درحقیقت خطاب کا انداز ہے کہ براہِ راست گفتگو ہو رہی ہے۔ اس طرح کی تکرار آپ کو دعائے قنوت میں ملے گی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ‘ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ‘ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ‘ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ‘ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ‘

اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ، وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ، وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ، وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ، اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن

سب سے پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ذکر کی ایک شکل ہے ذکرِ غیابی اور دوسری ہے ذکرِ حضوری یا خطابی اور ذکرِ حضوری یا ذکرِ خطابی کا بلند ترین ذریعہ نماز ہے۔ اس کو ایک پہلو سے اور سمجھ لیجیے۔ سورۃ الفاتحہ جسے ''الصلوٰۃ'' کہا گیا ہے اس میں تدریجاً ذکرِ غیاب سے ذکرِ حضور کی طرف پیش قدمی ہوتی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○﴾ یہ ذکرِ غیابی ہے، ابھی خطاب نہیں آیا۔ یہ وہی جملہ اسمیہ ہے۔ ''کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ جو رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک ہے''۔ اب آگے غیاب سے حضور کی طرف پیش قدمی ہے: ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○﴾۔ پہلے ایک معاہدہ، ایک اقرار، اعتراف اور وعدہ ہے اور اس کے بعد دعا اور استدعا ہے۔ یہ ہے غیاب سے حضور کی طرف تدریجاً ارتقاء۔ صوفیائے کرام نماز کو اہلِ ایمان کی معراج قرار دیتے ہیں: ''اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ''۔ مخاطبۂ الٰہی کا براہِ راست شرف حضور اکرم ﷺ کو معراج میں حاصل ہوا ہے اور ''التحیات'' کا سارا مکالمہ وہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو نوٹ کر لیجیے کہ باقی وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے ہوئی ہے یا کوئی الہام ہوا ہے یا حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر کوئی شے القا کی گئی ہے، لیکن جو مخاطبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دنیا ہی میں کوہِ طور کی بلندیوں پر حاصل ہوا ہے، یہ براہِ راست مخاطبہ حضور ﷺ کو معراج کی شب حاصل ہوا۔ اسی لیے نماز کو ''معراج المؤمنین'' قرار دیا گیا کہ اس میں وہی براہِ راست مخاطبہ و مکالمہ اور وہی گفتگو ہو رہی ہے۔

اس کے ضمن میں وہ حدیثِ قدسی بھی یاد رہنی چاہیے جس کی مزید تفصیل حضور ﷺ نے بیان کی ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((یَقُوْلُ اللّٰہُ تَعَالٰی:)) ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''۔ ((قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ

وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ)) ''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے مابین نصف نصف تقسیم کر دیا ہے''۔ اب یہاں تک تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جملہ ہے اور اس سے آگے کا بیان حضور ﷺ کی جانب سے ہے۔ فرمایا: ((اِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ.....)) ''جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ تو پروردگار کہتا ہے کہ ''میرے بندے نے میری حمد کی''۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ تو پروردگار کہتا ہے: ((اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ)) ''میرے بندے نے میری ثناء کی''۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ تو اللہ فرماتا ہے: ((مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ)) ''میرے بندے نے میری بڑی بزرگی بیان کی''۔ پھر جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ تو اللہ فرماتا ہے: ((ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ)) ''یہ ہے میرے اور میرے بندے کے درمیان، اور میرے بندے کے لیے ہے جو اُس نے طلب کیا''۔ اس لیے کہ اس میں طلب بھی ہے کہ ہم تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔

﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ فعل مضارع ہے اور اس میں زمانہ حال اور مستقبل دونوں طرح ترجمہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ترجمہ یوں ہوگا: ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے۔ اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے''۔ اگر حال میں اس کا ترجمہ کریں تو یہ اعتراف اور اظہارِ حال ہے۔ اللہ کرے کہ واقعتاً وہ صحیح اظہارِ حال ہو اور ہم واقعی اللہ کی بندگی کرتے ہوئے یہ کہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ورنہ اگر ہماری اصل صورتِ حال سے وہ مطابقت نہ رکھتا ہو تو پھر ایک طرح کا جھوٹ اور غلط بیانی ہو جائے گی۔ اور اگر اس کا ترجمہ مستقبل میں کریں تو یہ ہے عہد اور وعدہ کہ مستقبل میں ہم تیری ہی بندگی کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے رہیں گے۔

اب اس کے بعد اگلی تین آیتوں میں وہ استدعا اور دعا ہے اور اس حدیث میں اس کو ایک ہی جملے میں لیا گیا ہے کہ جب بندہ کہتا ہے: ﴿اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے: ((هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ)) ''یہ خالص میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ میں نے عطا کیا''۔ یعنی بندے نے ایک درخواست پیش کی ہے اور میں نے وہ درخواست قبول کرتے ہوئے اس کی مانگی ہوئی چیز اسے دے دی۔

یہ ہے اس کی تاثیر کا عالَم' بشرطیکہ یہ سارا معاملہ شعور کے ساتھ ہو اور ظاہر و باطن کے ساتھ قول اور فعل کی مطابقت بھی ہو تو اس کا اتنا اونچا مقام ہے کہ اِدھر ایک جملہ ادا ہوا اور اُدھر اللہ کی طرف سے response مل گیا۔ گویا ؎

اَفلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر' اُٹھتے ہیں حجاب آخر!

نماز: ذکرِ لسانی اور ذکرِ عملی کا مجموعہ

اب اس سے آگے بڑھیے۔ ذکر کی ایک اور شکل بھی ہے اور وہ ہے ذکرِ عملی۔ ہم نے کہا: ''اللہ اکبر'' کہ اللہ بہت بڑا ہے' اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ ایک اعتبار سے ذکرِ غیابی اور دوسرے اعتبار سے ذکرِ لسانی ہے اور اس کا ایک عملی مظہر (demonstration) بھی ہے۔ انسان زبان سے ''اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سیدھا سجدے میں گر جائے تو درحقیقت یہ اس اللہ اکبر کی تعمیل ہو رہی ہے۔ لہٰذا نماز میں ذکرِ غیابی بھی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کی پہلی تین آیات اور بعد از فاتحہ آپ نماز میں کچھ نہ کچھ قرآن بھی پڑھیں گے تو یہ ذکرِ غیابی ہے۔ پھر یہ کہ نماز میں ذکرِ حضوری اور ذکرِ خطابی بھی ہے کہ آپ نے اللہ سے عہد و پیمان کیا' قول و قرار کیا' استدعا کی۔ اس کے ساتھ ہی ذکرِ عملی بھی ہے کہ اللہ کی تعظیم میں انسان جھکتا ہے۔ آپ اپنے کسی بزرگ سے جب ملاقات کرتے ہیں تو ذرا جھک کر سلام کرتے ہیں۔ زیادہ جھکنے کی تو اجازت نہیں ہے' لیکن یہ جو تھوڑا سا خم آتا ہے' یہ آپ کی اندرونی کیفیت کا اظہار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی فطرت میں جیسے شکر ہے ویسے اس قدر تعظیم بھی فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ آپ استاد کے سامنے آئیں گے تو تھوڑا سا خم کھائیں گے۔ آپ اپنے کسی بزرگ رشتہ دار سے ملیں گے تو تھوڑا سا خم لامحالہ ہو جائے گا۔ یہ درحقیقت آپ کے اس فکر کی عملی تعبیر' اس کا عملی مظہر ہے کہ آپ نے اس ہستی کی تعظیم کی ہے اور اس کی عظمت کا اقرار اور

اعتراف کیا ہے۔

نماز میں بھی اللہ تعالیٰ کی عملی تعظیم ہے' جس میں پہلا درجہ رکوع ہے کہ ''اللہ اکبر'' کہہ کر آپ جھک جائیں اور اس کے بعد اس تعظیم کا آخری درجہ سجدہ ہے جس میں انسان اپنی پیشانی زمین پر ٹکا دیتا ہے۔ اگر یہ شعور کے ساتھ ہوا ہے تو گویا اس نے اپنی انانیت سے کامل دستبرداری اختیار کر کے اپنے آپ کو اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو یوں تعبیر فرمایا کہ جب سجدہ کرو تو یوں محسوس کرو کہ تم نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ درحقیقت انسان کی انانیت' میری مرضی' میری خواہش' میری پسند' میری عقل' میری منطق' میری choice' میرا اختیار' یہ سب چیزیں ہی درحقیقت ہمارے اندر موجود شیطنت کا مظہر ہیں۔ جب اس کو انسان حالت سجدہ میں اپنے ہاتھوں اپنے رب کے قدموں میں رکھ دیتا ہے تو اس وقت انسان سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ)) (رواہ مسلم) ''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے قریب ترین ہوتا ہے''۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ سجدہ واقعی سجدہ ہو۔ اس ضمن میں اقبال کا شعر بڑی صحیح تعبیر ہے ؎

وہ سجدہ' روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

یہ ہے اصل میں تعبیر!! سجدوں پر سجدے اور رکعتوں کے ڈھیر لگ گئے ہوں اور نمازِ عشاء کی پوری سترہ رکعتیں آپ نے ادا کی ہوں (آپ کو معلوم ہے کہ سترہ رکعتوں میں ۳۴ سجدے ہو گئے) لیکن اگر وہ کیفیت آپ کے ذہن کی' آپ کی نفسیات کی' آپ کے قلب اور آپ کے شعور کی صحیح صحیح عکاسی نہیں کر رہی ہے تو پھر اس نماز سے ثواب تو ملے گا' لیکن وہ کیفیت حاصل نہیں ہو گی کہ انسان اپنے رب کے قریب ترین ہو جائے۔

اس نماز پر ثواب کا نہ ملنا تو گویا ظلم ہو گا اور اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ثواب ملے گا' بشرطیکہ اس نماز میں کوئی ریاکاری نہ ہو۔ اگر دوسروں کو دکھانے کے لیے کوئی نماز پڑھی

گئی ہے تو یہ ریاکاری ہے جو درحقیقت زیرو کی مانند ہے‘ اور اس سے جو شے ضرب کھاتی ہے وہ زیرو ہو جاتی ہے۔ ایک کروڑ کے عدد کو بھی آپ زیرو سے ضرب دیں گے تو وہ زیرو ہو جائے گا‘ لہٰذا ریاکاری تو زیرو کر دینے والی شے ہے‘ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ شرک تک پہنچا دیتی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہ احمد)

’’جس نے دکھاوے کی خاطر نماز پڑھی اُس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کی خاطر روزہ رکھا اس نے شرک کیا‘ اور جس نے دکھاوے کی خاطر صدقہ وخیرات کیا اس نے بھی شرک کیا۔‘‘

لیکن اگر ریاکاری اور کوئی بدنیتی نہیں ہے تو اس نماز کا اجر تو لازم ہے‘ اس لیے کہ اس نے کچھ نہ کچھ تو اپنا وقت قربان کیا ہے۔ لیکن یہ نماز وہ نماز نہیں ہے کہ جس کے ایک سجدے سے روحِ زمین کانپ جاتی تھی۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور وہ جب اپنے گہرے شعور اور احساس کے ساتھ سربسجود ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے قریب ترین ہو جاتا ہے۔

خلاصۂ گفتگو

میری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ اپنے ذہن میں ایک بار پھر سے تازہ کر لیں کہ میں نے تین چیزوں کے حوالے سے آپ کے سامنے باتیں رکھی ہیں: پہلی منزل تو معرفتِ ربّ کا حصول ہے اور اس کے حاصل ہو جانے کے بعد اب تین ضرورتیں ہیں:

(۱) فکرِ صحیح کی صحیح رخ پر مزید پیش قدمی۔ اس کے لیے جہاں فکر درکار ہے وہاں ذکر بھی درکار ہے اور اس ذکر کی جامع ترین صورت نماز ہے۔

(۲) انسان کے عمل کا درست رہنا۔ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں ایک شخص کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کا نام قرآن میں تو مذکور نہیں ہے‘ لیکن تورات میں اس کا نام ’’بلعم بن باعورہ‘‘ مذکور ہے۔ وہ بہت بڑا عالم و فاضل تھا۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ﴿اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا﴾ کہ ہم نے اسے اپنی آیات عطا کی تھیں ..... اور آگے فرمایا: ﴿وَلَوْ شِئْنَا

لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (الاعراف:۱۷۶) ’’اور ہم چاہتے تو اسے اور ترفع اور بلندی عطا کرتے‘ لیکن وہ تو زمین ہی کی طرف دھنستا چلا گیا‘‘۔ گویا کوئی ایک لغزش انسان کے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر سکتی ہے۔ ذرا سا عدمِ توازن اُس کے رُخ کو ٹیڑھا کر دے گا اور جب ایک دفعہ ٹیڑھ ہو گئی تو شروع میں تو زاویہ چاہے دس درجے کا ہی ہو‘ لیکن جیسے جیسے عمل کی پیش قدمی ہو گی تو فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا اور انحراف شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ اس عمل کی درستگی کے لیے تعلق مع اللہ لازم ہے اور تعلق مع اللہ کا بھی سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔

(۳) تیسری چیز روحانی بالیدگی اور روحانی ترقی ہے اور اس کے لیے تقرّب الی اللہ ضروری ہے! اس اعتبار سے بھی کہ تقرّب کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف ارتکازِ توجہ ضروری ہے تو اس کا ذریعہ بھی نماز ہے: ﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾۔ اور پھر اس اعتبار سے بھی کہ اسی کے ذریعے عشقِ الٰہی کی بجھتی ہوئی چنگاری کو پھر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی محبت کی وہ حرارت جو راکھ میں دَب گئی ہو یا اس میں کچھ کمی آ گئی ہے تو اس کو جھاڑ کر راکھ کو ہٹا کر از سرِ نو ایک حرارت پیدا کرنا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ جس مادے سے ماخوذ ہے‘ اس کا بنیادی مفہوم یہی ہے: تاپنا‘ حرارت حاصل کرنا‘ آگ جلانا‘ آگ روشن کرنا۔

الغرض‘ فلسفۂ دین اور صحیح تر لفظ میں حکمتِ دین میں نماز کی اہمیت کے حوالے سے تو میری یہ گفتگو ہے۔ باقی یہ کہ نظامِ دین میں تین اعتبارات سے نماز کی اہمیت زیر بحث آئے گی۔ نظامِ دین میں سب سے پہلے انفرادی سیرت کی تعمیر‘ ثانیاً معاشرے کی تنظیم اور پھر اس کے علاوہ جو دو عنوانات طے کیے گئے ہیں کہ خادمانِ دین اور طالبانِ قرآن کو کس کس اعتبار سے نماز سے مدد ملتی ہے‘ تو ان چاروں موضوعات پر کل گفتگو ہو گی‘ ان شاء اللہ!

(جاری ہے)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ الدُّخَان

آیات ۱ تا ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا
کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ﴿۳﴾ فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ ﴿۴﴾ اَمۡرًا مِّنۡ
عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا کُنَّا مُرۡسِلِیۡنَ ﴿۵﴾ رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ
السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ۟ اِنۡ
کُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِیۡنَ ﴿۷﴾ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ؕ رَبُّکُمۡ وَ رَبُّ
اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸﴾ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ شَکٍّ یَّلۡعَبُوۡنَ ﴿۹﴾ فَارۡتَقِبۡ یَوۡمَ
تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۰﴾ یَّغۡشَی النَّاسَ ؕ ہٰذَا عَذَابٌ
اَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اکۡشِفۡ عَنَّا الۡعَذَابَ اِنَّا مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰی لَہُمُ
الذِّکۡرٰی وَ قَدۡ جَآءَہُمۡ رَسُوۡلٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَ
قَالُوۡا مُعَلَّمٌ مَّجۡنُوۡنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا کَاشِفُوا الۡعَذَابِ قَلِیۡلًا اِنَّکُمۡ
عَآئِدُوۡنَ ﴿۱۵﴾ یَوۡمَ نَبۡطِشُ الۡبَطۡشَۃَ الۡکُبۡرٰی ۚ اِنَّا مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۱۶﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ①﴾ ’’ح‘ م۔‘‘

آیت ۲ ﴿وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②﴾ ’’قسم ہے اس روشن کتاب کی۔‘‘

جیسا کہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں عرض کیا گیا‘ سورۃ الدخان کی سورۃ الزخرف کے ساتھ

نسبتِ زوجیت ہے اور اس کی ایک علامت یہ ہے کہ دونوں سورتوں کی دو ابتدائی آیات مشترک ہیں اور ان کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کی طرح یہاں اس آیت میں بھی قرآن کی قسم کا جواب قسم یا مقسم علیہ محذوف ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے کہ ایسے مقامات پر مقسم علیہ گویا وہی حقیقت ہے جس کا ذکر سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں ہو چکا ہے: ﴿یٰسٓ ① وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ② اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ③﴾۔ چنانچہ یہاں پر اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کو مقدر (understood) مانتے ہوئے آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یوں ہوگا: ’’اے محمد (ﷺ) یہ کتابِ مبین گواہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں‘‘۔ گویا یہ روشن اور واضح کتاب‘ یہ قرآن آپؐ کی رسالت کا قطعی ثبوت ہے۔

آیت ۳ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ ’’یقیناً ہم نے اس کو نازل کیا ہے ایک مبارک رات میں‘‘

یہ مضمون سورۃ القدر میں واضح تر انداز میں آیا ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ کہ ہم نے اسے ’’لیلۃ القدر‘‘ میں نازل فرمایا۔ چونکہ قرآن مجید میں عام طور پر اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ آئے ہیں اس لیے اس خاص رات کا ذکر بھی دو مرتبہ آیا ہے۔ وہاں ’’لیلۃ القدر‘‘ کے نام سے اور یہاں ’’لیلۃ مبارکۃ‘‘ کے نام سے۔

﴿اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ③﴾ ’’یقیناً ہم خبردار کر دینے والے ہیں۔‘‘

رسالت اور انزالِ کُتب کا اصل مقصد لوگوں کا انذار (خبردار کرنا‘ آگاہ کرنا) ہے۔ جیسے سورۃ المدثر میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ②﴾ ’’اے چادر اوڑھنے والے‘ اٹھئے اور (لوگوں کو) خبردار کیجیے‘‘۔ دنیا کی زندگی اصل زندگی نہیں ہے۔ یہ تو اصل ’’کتابِ زندگی‘‘ کے دیباچے کی مانند ہے۔ اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے لوگوں کو خبردار (warn) کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم السلام اور الہامی کتب کے ذریعے ہدایت کے ایک سلسلے کا اہتمام فرمایا تاکہ ان میں اصل اور ہمیشہ کی زندگی کو بہتر بنانے کا شعور پیدا ہو اور وہ اس کے لیے تیاری کر سکیں: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ (العنکبوت) ’’یہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں‘ جبکہ آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!‘‘

آیت ۴ ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ ''اس رات میں تمام پرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔''

اس سے پہلے ہم سورۃ السجدۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ تدبیرِ کائنات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی ایک ہزار سال کی ہوتی ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵﴾ ''وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف' پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اس کی طرف' (یہ سارا معاملہ طے پاتا ہے) ایک دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے حساب سے ایک ہزار برس ہے''۔ البتہ انسانی معاملات کے حوالے سے یہ رات (لیلۂ مبارکہ) گویا اللہ تعالیٰ کی کائناتی سلطنت (Cosmic Empire) کے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے —— لفظ فرق کے لغوی معنی علیحدہ کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ يُفْرَقُ کا درست مفہوم یہ ہوگا کہ فیصلے جاری (issue) کر دیے جاتے ہیں۔ یعنی یہ وہ رات ہے جس میں تمام سال کے فیصلے طے کر کے تعمیل و تنفیذ (implementation) کے لیے ملائکہ کے حوالے کر دیے جاتے ہیں جو اس عظیم سلطنت کی ''سول سروس'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ گزشتہ آیت کے مطابق یہ وہی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو لوحِ محفوظ یا اُمّ الکتاب سے آسمانِ دنیا پر اتارا۔

آیت ۵ ﴿اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝۵﴾ ''طے شدہ احکام ہماری طرف سے۔ یقیناً ہم ہی ہیں (رسولوں کو) بھیجنے والے۔''

آیت ۶ ﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶﴾ ''رحمت کے طور پر آپ کے رب کی طرف سے۔ یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا۔''

یہ تمام فیصلے یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر قرآن کا نزول اور نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت تو نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت کا مظہر ہے۔

آیت ۷ ﴿رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝۷﴾ ''آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے مابین ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو!''

یقیناً ساری کائنات کا پروردگار اور مالک اللہ ہی ہے۔ اس حقیقت کو مان لینا تو آسان ہے لیکن دل کی گہرائیوں میں اس کا یقین بٹھانا انسان کے لیے بہت مشکل ہے۔ انسان کا نفس اس سلسلے میں اسے قدم قدم پر دھوکہ دیتا ہے کہ فلاں چیز میری ہے اور فلاں چیز کا مالک میں ہوں۔

بہر حال ہمیں دل سے یقین کر لینا چاہیے کہ ہر چیز اللہ کی ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے: ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست در حقیقت مالکِ ہر شے خداست!

گویا ہر انسان کی جان' اس کا جسم' جسم کے اعضاء اور زیر استعمال اشیاء وغیرہ اس کے پاس چند روز کے لیے امانت ہیں۔ حقیقت میں ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ آخرت میں ان میں سے ایک ایک امانت کا حساب لیا جائے گا اور اس حساب کے دوران انسان کے اپنے اعضاء اپنے مالک حقیقی کے سامنے اس کے خلاف گواہیاں دیں گے۔

آیت ۸ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی مارتا ہے۔''

﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸﴾ ''وہ تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے آباء و اجداد کا بھی رب ہے۔''

آیت ۹ ﴿بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝۹﴾ ''لیکن یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ جب اہلِ مکہ کے سامنے قرآن پیش کرتے تھے تو ان میں سے اکثر لوگ اسے کلام اللہ ماننے کے بجائے اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ پھر اسی بنا پر وہ حضور ﷺ کا مذاق بھی اڑاتے تھے کہ دیکھیں جی! یہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰﴾ ''تو آپ انتظار کیجیے اُس دن کا جس دن آسمان لائے گا واضح دھواں۔''

اس آیت کے مفہوم کے بارے میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف صحابہ کرامؓ کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ' ابن عمرؓ' ابن عباسؓ اور ابوسعید خدریؓ اور حسن بصریؒ جیسے اکابر کی رائے ہے کہ اس سے وہ دھواں مراد ہے جو قیامت سے پہلے نمودار ہوگا۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے قیامت سے فوراً پہلے نمودار ہونے والی جن دس نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں دھویں (دخان) کا ذکر بھی ہے۔ اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بڑی شدت کے ساتھ یہ رائے ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت کے ابتدائی سالوں میں مکہ میں جو قحط پڑا تھا اس آیت میں اس قحط کے بارے میں پیشگی خبردار کیا گیا ہے۔

صحرائی علاقوں میں اگر طویل مدت تک بارش نہ ہو تو پوری فضا گرد سے اَٹ جاتی ہے اور آسمان کی طرف دیکھنے سے یوں لگتا ہے جیسے دھویں کے بادل چھا رہے ہیں۔ قحط کا یہ عذاب دراصل اسی قانونِ خداوندی کے تحت اہلِ مکّہ پر مسلّط ہوا تھا جس کا ذکر سورۃ الانعام میں اس طرح ہوا ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ ''اور ہم نے بھیجا ہے (دوسری) امتوں کی طرف بھی آپؐ سے قبل (رسولوں کو) 'پھر ہم نے پکڑا انہیں سختیوں اور تکلیفوں سے شاید کہ وہ عاجزی کریں''۔ تابعین میں سے مجاہدؒ قتادہؒ ابراہیم نخعی وغیرہ حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ بہرحال میں نے یہاں جلیل القدر صحابہؓ کی آراء بیان کر دی ہیں۔ ان صحابہؓ کے عظیم مراتب کے پیش نظر ان آراء میں محاکمہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔

آیت ۱۱ ﴿يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ''وہ ڈھانپ لے گا لوگوں کو۔ یہ ایک دردناک عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۲ ﴿رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ﴾ ''(اُس وقت لوگ کہیں گے:) اے ہمارے رب! اس عذاب کو ہم سے دور کر دے، ہم ایمان لانے والے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ﴾ ''کہاں ہے ان کے لیے یاددہانی کی استعداد جبکہ آچکا ہے ان کے پاس ایک واضح کر دینے والا رسول!''

آیت ۱۴ ﴿ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ﴾ ''پھر انہوں نے منہ پھیر لیا اس کی طرف سے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے۔''

معاذ اللہ! نقل کفر کفر نباشد! وہ حضور ﷺ کے بارے میں ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ ان کو یہ باتیں کسی اور نے سکھائی ہیں اور کبھی کہتے کہ ان پر آسیب اور جنّات وغیرہ کا اثر ہو گیا ہے اور ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ معاذ اللہ!

آیت ۱۵ ﴿اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَاۗىِٕدُوْنَ﴾ ''ہم دور کر دیں گے اس عذاب کو تھوڑی دیر کے لیے، تو تم لوٹ کر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔''

جیسے آلِ فرعون کے معاملے میں ہم سورۃ الاعراف کے چھٹے رکوع میں پڑھ چکے ہیں کہ ان پر پے در پے سات عذاب بھیجے گئے تھے۔ ہر مرتبہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے دعا کریں اور ہر بار وعدہ کیا کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو وہ ایمان لے آئیں گے۔

مگر جب عذاب ٹل جاتا تو وہ اپنے وعدے سے پھر جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کو اپنے مذکورہ موقف کے حق میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر اس دھویں سے مراد قبل از قیامت کا دھواں ہوتا تو اس کے دور کیے جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس لیے اس سے مراد اسی نوعیت کا عذاب ہے جو کسی رسول کی بعثت کے بعد لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور جس کا مقصد اور اصول سورۃ السجدۃ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''اور ہم انہیں لازماً چکھائیں گے قریب کے کچھ چھوٹے عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ یہ باز آجائیں۔''

آیت ۱۶ ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ﴾ ''جس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ (اُس دن) یقیناً ہم پورا پورا انتقام لیں گے۔''

آیات ۱۷ تا ۳۳

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۙ﴿۱۷﴾
اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا
تَعْلُوْا عَلَي اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۚ﴿۱۹﴾ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ
وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۚ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾
فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا
اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾
كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾
وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۡ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا
اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا
مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ
الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ
لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا
فِيْهِ بَلٰۗؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

آیت ۱۷ ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۙ﴾ ''اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قومِ فرعون کو بھی' اور ان کے پاس بھی ایک بہت معزز رسول آیا تھا۔''

آیت ۱۸ ﴿اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ﴾ ''(اس پیغام کے ساتھ) کہ تم اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ یقیناً میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک معزز اور امانت دار رسول ہوں اور تمہاری طرف اللہ کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دو۔

آیت ۱۹ ﴿وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَي اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ ''اور یہ کہ تم اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں ایک واضح سند۔''

اگر تم لوگ میری مخالفت کرو گے تو یہ گویا اللہ کی مخالفت اور اس کے خلاف سرکشی ہوگی۔ اس لیے کہ میں اللہ کا نمائندہ ہوں اور اسی کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۚ﴾ ''اور میں نے پناہ پکڑ لی ہے اپنے اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔''

آیت ۲۱ ﴿وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝﴾ ''اور اگر تم لوگ میری بات نہیں مانتے ہو تو مجھ سے دور رہو!''

تمہاری سازشوں کے خلاف چونکہ میں نے اپنے رب کی پناہ حاصل کر لی ہے اس لیے اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو بھی میرے خلاف کوئی عملی اقدام کرنے سے باز رہنا۔

آیت ۲۲ ﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝﴾ ''پھر اُس نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ مجرم قوم ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

آیت ۲۳ ﴿فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۙ﴾ ''پس میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ' آگاہ رہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔''

آیت ﴿وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ﴾ ''اور چھوڑ دینا سمندر کو ساکن!''

ہم سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنا دیں گے' اس راستے سے گزر جانے کے بعد اسے اسی طرح ساکن چھوڑ دینا۔

﴿اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝﴾ ''یہ ایک لشکر ہیں جو غرق کیے جائیں گے۔''

فرعون کا لشکر تمہارا تعاقب کرے گا اور اُسی راستے سے گزرنے کی کوشش کرے گا' لیکن ہم اس کو غرق کر دیں گے۔

آیت ﴿كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝﴾ ''انہوں نے کتنے ہی باغوں' چشموں' کھیتوں اور شاندار رہائش گاہوں کو چھوڑا۔''

آیت ۲۷ ﴿وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝﴾ ''اور کیسی کیسی نعمتوں کو جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے۔''

آیت ۲۸ ﴿كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝﴾ ''یوں ہی ہوا' اور ہم نے وارث بنا دیا ان چیزوں کا دوسرے لوگوں کو۔''

آیت ۲۹ ﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاۗءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝﴾ ''تو نہ اُن پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی گئی۔''

آیت ۳۰ ﴿وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝﴾ ''اور ہم نے نجات دے دی بنی اسرائیل کو ذلت آمیز عذاب سے۔''

آیت ۳۱ ﴿مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾ ''یعنی فرعون سے' یقیناً وہ بڑا ہی سرکش' حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔''

ایک طرف تو وہ معصیت کے ارتکاب میں حد سے بڑھا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی سرشت میں سرکشی بھی بہت تھی۔

آیت ۳۲ ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ''اور ہم نے علم رکھنے کے باوجود اُن (بنی اسرائیل) کو اقوامِ عالم پر ترجیح دی تھی۔''

بنی اسرائیل کی تمام خرابیاں اور کوتاہیاں ہمارے علم میں تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے دنیا کی تمام اقوام پر انہیں فضیلت دے کر برگزیدہ کیا تھا۔ بنی اسرائیل کی اس فضیلت کا ذکر قرآن

حکیم میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں یہ آیت دو مرتبہ (۴۷ اور ۱۲۲) آئی ہے: ﴿یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی جہان والوں پر۔''

قرآن کریم (خصوصی طور پر سورۃ البقرۃ) میں بنی اسرائیل کے بڑے بڑے جرائم بھی گنوائے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سوادِ اعظم مسلسل توحید سے چمٹا رہا تھا۔ اگرچہ گاہے بگاہے ان میں مشرکانہ نظریات و اوہام بھی پنپتے رہے لیکن ان کی اکثریت بہرحال توحید پر قائم رہی۔ مثلاً ایک زمانے میں ان کے درمیان ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتا تھا لیکن اس دور میں بھی مجموعی طور پر ان میں سے اکثر لوگ توحید پرست ہی رہے۔

آیت ۳۲ ﴿وَاٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنَ الۡاٰیٰتِ مَا فِیۡہِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیۡنٌ ۳۳﴾ ''اور ہم نے انہیں بہت سی ایسی نشانیاں دیں جن میں بہت واضح آزمائش تھی۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کو بار بار ایسی آزمائشوں سے دوچار کیا گیا جو ان کے لیے ''بَلَآءً حَسَنًا'' (الانفال:۱۷) کا درجہ رکھتی تھیں۔ یعنی ایسی آزمائشیں جو انسان کی بھلائیوں کو بڑھانے اور اچھائیوں کو نکھارنے کا باعث بنتی ہیں۔

آیات ۳۴ تا ۵۹

اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَیَقُوۡلُوۡنَ ۳۴ اِنۡ ہِیَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰی وَ مَا نَحۡنُ
بِمُنۡشَرِیۡنَ ۳۵ فَاۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۳۶ اَہُمۡ خَیۡرٌ اَمۡ
قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ اَہۡلَکۡنٰہُمۡ ۫ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا
مُجۡرِمِیۡنَ ۳۷ وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا
لٰعِبِیۡنَ ۳۸ مَا خَلَقۡنٰہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا
یَعۡلَمُوۡنَ ۳۹ اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِیۡقَاتُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ۴۰ یَوۡمَ لَا یُغۡنِیۡ
مَوۡلًی عَنۡ مَّوۡلًی شَیۡئًا وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ۴۱ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰہُ ؕ
اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۴۲ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۴۳ طَعَامُ

الۡاَثِیۡمِ ۴۴ کَالۡمُہۡلِ ۚ یَغۡلِیۡ فِی الۡبُطُوۡنِ ۴۵ کَغَلۡیِ الۡحَمِیۡمِ ۴۶ خُذُوۡہُ
فَاعۡتِلُوۡہُ اِلٰی سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ ۴۷ ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِہٖ مِنۡ
عَذَابِ الۡحَمِیۡمِ ۴۸ ذُقۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ ۴۹ اِنَّ ہٰذَا مَا
کُنۡتُمۡ بِہٖ تَمۡتَرُوۡنَ ۵۰ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ۵۱ فِیۡ جَنّٰتٍ
وَّ عُیُوۡنٍ ۚ ۵۲ یَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّ اِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ ۚ ۵۳
کَذٰلِکَ ۟ وَ زَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ۵۴ یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِکُلِّ فَاکِہَۃٍ
اٰمِنِیۡنَ ۵۵ لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡہَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَۃَ الۡاُوۡلٰی ۚ وَ وَقٰىہُمۡ
عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ۵۶ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکَ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۵۷
فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ۵۸ فَارۡتَقِبۡ اِنَّہُمۡ
مُّرۡتَقِبُوۡنَ ۵۹

آیت ۳۴ ﴿اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ لَیَقُوۡلُوۡنَ ۳۴﴾ ''یہ لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں۔''

ہٰۤؤُلَآءِ سے یہاں اہلِ مکّہ مراد ہیں۔ چونکہ یہ مکی سورت ہے اس لیے بنی اسرائیل کا ذکر کرنے کے بعد اب مشرکینِ مکّہ کے اقوال و عقائد پر تبصرہ ہونے جا رہا ہے۔

آیت ۳۵ ﴿اِنۡ ہِیَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰی وَ مَا نَحۡنُ بِمُنۡشَرِیۡنَ ۳۵﴾ ''کچھ نہیں مگر ہماری یہ پہلی موت ہی ہوگی اور ہم (دوبارہ) اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

کہ بس ہماری موت کے ساتھ ہی ہماری زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کے عقیدے کو ہم نہیں مانتے۔

آیت ۳۶ ﴿فَاۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۳۶﴾ ''تو لاؤ ذرا ہمارے آباء و اجداد کو اگر تم سچے ہو!''

اپنے موقف کے حمایت میں وہ لوگ یہ دلیل دیتے کہ اگر تم بعث بعد الموت کے عقیدے کو سچ مانتے ہو تو ذرا ہمارے فوت شدہ آباء و اجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ!

آیت ۳۷ ﴿اَہُمۡ خَیۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ﴾ ''کیا یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟''

یمن کے قدیم بادشاہ ''تُبّع'' کہلاتے تھے۔ جس طرح پرانے زمانے میں مصر کے

بادشاہوں کا لقب ''فرعون'' اور عراق کے بادشاہوں کا لقب ''نمرود'' تھا اسی طرح یمن کے بادشاہوں کا لقب ''تُبّع'' تھا۔

﴿اَهۡلَكۡنٰهُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ۝۳۷﴾ ''ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا' بے شک وہ سب کے سب مجرم تھے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَمَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ ۝۳۸﴾ ''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے مابین ہے محض کھیل کے طور پر تو تخلیق نہیں فرمایا۔''

آیت ۳۹ ﴿مَا خَلَقۡنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۳۹﴾ ''اور ہم نے نہیں بنایا ان دونوں کو مگر حق کے ساتھ' مگر ان لوگوں کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ مِيۡقَاتُهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۴۰﴾ ''یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا وقتِ معین ہے۔''

آیت ۴۱ ﴿يَوۡمَ لَا يُغۡنِىۡ مَوۡلًى عَنۡ مَّوۡلًى شَيۡـئًا وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝۴۱﴾ ''جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آ سکے گا اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔''

آیت ۴۲ ﴿اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۝۴۲﴾ ''سوائے اُس کے جس پر اللہ رحم فرما دے۔ یقیناً وہی ہے زبردست' بہت رحم فرمانے والا۔''

آیت ۴۳ ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝۴۳﴾ ''یقیناً زقوم کا درخت۔''

آیت ۴۴ ﴿طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ ۝۴۴﴾ ''گنہگاروں کا کھانا ہے۔''

آیت ۴۵ ﴿كَالۡمُهۡلِ ۚ يَغۡلِىۡ فِى الۡبُطُوۡنِ ۝۴۵﴾ ''پگھلے ہوئے تانبے کی طرح' کھولے گا پیٹوں کے اندر۔''

اس درخت کا ذکر اس سے پہلے سورۃ الصافات کے دوسرے رکوع میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے شگوفے نہایت بدشکل' بدذائقہ اور بدبودار ہوں گے' لیکن اہلِ جہنم اس کو کھانے پر مجبور ہوں گے۔ جب وہ بھوک سے بے حال ہو کر اس کو کھائیں گے تو وہ ان کے پیٹوں میں پگھلے ہوئے تانبے کی طرح جوش مارے گا۔

آیت ۴۶ ﴿كَغَلۡىِ الۡحَمِيۡمِ ۝۴۶﴾ ''جیسے گرم پانی کھولتا ہے۔''

آیت ۴۷ ﴿خُذُوۡهُ فَاعۡتِلُوۡهُ اِلٰى سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ ۝۴۷﴾ ''(پھر کہا جائے گا:) پکڑو اس کو

اور دھکیلتے ہوئے لے جاؤ اسے عین جہنم کے بیچوں بیچ۔''

آیت ۴۸ ﴿ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِهٖ مِنۡ عَذَابِ الۡحَمِيۡمِ ۝۴۸﴾ ''پھر انڈیل دو اس کے سر کے اوپر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب۔''

آیت ۴۹ ﴿ذُقۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡكَرِيۡمُ ۝۴۹﴾ ''اب چکھو! تم تو بڑے طاقتور' بہت معزز تھے نا!''

ہاں اے ابوجہل! تمہیں اپنی سرداری اور جتھے داری پر بڑا فخر تھا نا! اور ولید بن مغیرہ! تم بھی تو اپنی دولت اور جوان بیٹوں کے بل پر بڑے اکڑتے تھے نا! آج جہنم کی آگ' زقوم کے کھانے اور کھولتے ہوئے پانی کے عذاب کا مزا چکھو! اب یہی تم لوگوں کا مقدر ہے۔

آیت ۵۰ ﴿اِنَّ هٰذَا مَا كُنۡتُمۡ بِهٖ تَمۡتَرُوۡنَ ۝۵۰﴾ ''یقیناً یہی ہے وہ چیز جس کے بارے میں تم شک کرتے تھے۔''

آیت ۵۱ ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ مَقَامٍ اَمِيۡنٍ ۝۵۱﴾ ''(اس کے برعکس) متقین بڑی امن والی جگہ میں ہوں گے۔''

آیت ۵۲ ﴿فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۝۵۲﴾ ''باغات اور چشموں میں۔''

آیت ۵۳ ﴿يَّلۡبَسُوۡنَ مِنۡ سُنۡدُسٍ وَّاِسۡتَبۡرَقٍ مُّتَقٰبِلِيۡنَ ۝۵۳﴾ ''باریک اور موٹے ریشم کا لباس پہنیں گے' ایک دوسرے کی طرف رخ کیے ہوئے (بیٹھے ہوں گے)۔''

ان کا نیچے کا لباس موٹے ریشم کا جبکہ اوپر کا لباس باریک ریشم کا ہوگا۔

آیت ۵۴ ﴿كَذٰلِكَ ۖ وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ ۝۵۴﴾ ''اسی طرح ہوگا' اور ہم ان سے بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔''

آیت ۵۵ ﴿يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيۡنَ ۝۵۵﴾ ''وہ طلب کریں گے اس میں ہر طرح کے پھل اطمینان کے ساتھ۔''

جنت کے پھلوں میں سے جس پھل کی وہ خواہش کریں گے وہ ان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

آیت ۵۶ ﴿لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَةَ الۡاُوۡلٰى ۚ وَوَقٰىهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ ۝۵۶﴾ ''وہ نہیں چکھیں گے اس میں موت سوائے اس پہلی موت کے' اور اللہ نے

انہیں بچالیا ہے جہنم کے عذاب سے۔‘‘

دنیا میں انہیں جو موت آئی تھی وہی ان کی آخری موت ہوگی‘ اب انہیں موت کی سختی کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور جنت میں ان کا قیام ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے ان بندوں میں شامل کرلے‘ آمین!

آیت ﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۵۷﴾ ’’یہ فضل ہوگا آپ کے رب کی طرف سے۔ یقیناً یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔‘‘

بلاشبہ اس میں ان کی نیکیوں اور محنت کا بھی حصہ ہوگا‘ لیکن اُس دن کی کامیابی نیک اعمال کی کثرت کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے خصوصی فضل کے بغیر ممکن نہیں ہوگی۔

آیت ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّھُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۵۸﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے آپ کی زبان پر‘ تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔‘‘

قرآن کی زبان بہت فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود بڑی سادہ اور آسان ہے۔ بعض مصنفین دقیق اور ثقیل الفاظ استعمال کر کے قارئین پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ عربی کی کتاب ’’مقاماتِ حریری‘‘ پڑھیں تو اس میں آپ کو بھاری بھرکم اور نامانوس الفاظ کی کثرت سے محسوس ہوگا کہ شاید کتاب لکھنے سے مصنف کا مقصود صرف اپنے ذخیرۂ الفاظ کا مظاہرہ کرنا ہی ہے۔ بہرحال قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کا مقصد بنی نوعِ انسان کو ہدایت دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) قرآن کی عبارت کے ذریعے سے اپنی زبان دانی کی مہارت کا مظاہرہ کرنا مقصود نہیں تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں اگر ایک طرف ہمیں فصاحت و بلاغت کی معراج نظر آتی ہے تو دوسری طرف اس کی عبارت میں سہل ممتنع اور سادگی کا اعجاز بھی دکھائی دیتا ہے۔

آیت ﴿فَارْتَقِبْ اِنَّھُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝۵۹﴾ ’’تو آپ انتظار کیجیے‘ یہ بھی انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

یہی لفظ (فَارْتَقِبْ) قبل ازیں آیت ۱۰ میں بھی آیا ہے‘ جہاں دھویں کے عذاب کا ذکر ہے۔ گویا یہاں ایک دفعہ پھر اسی عذاب کے بارے میں پیشگی طور پر خبردار کر دیا گیا ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک اہلِ مکہ پر خشک سالی اور قحط کی صورت میں آنے والا تھا۔

❁❁❁

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۲۰)

جہاد کی عظمت و اہمیت

اور جہاد و قتال کا مقصد

شجاع الدین شیخ ☆

آج کا درس دو حصوں پر مشتمل ہے‘ پہلے حصے میں سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کی روشنی میں جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و اہمیت اور دوسرے حصے میں سورۃ الصّف کی آیت ۹ کی روشنی میں جہاد و قتال کے مقصد پر گفتگو ہوگی۔

جہاد کی عظمت اور اہمیت

جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت اور اہمیت کا بیان سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کی روشنی میں ہوگا‘ لہٰذا پہلے اس آیت کے پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس آیت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ۸ ہجری میں ہوا۔ بعض لوگوں نے رشتہ داری کے تعلق کو اہمیت دیتے ہوئے جنگ سے گریز کی خواہش کا اظہار کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نزول فتح مکہ سے قبل ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لا چکے تھے اور اب انہیں اپنے ہی لوگوں اور رشتہ داروں کے خلاف اقدام کے لیے جانا تھا تو اس سے قبل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ذہن سازی سورۃ التوبہ کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں کی گئی۔ یہاں ہمیں یہ سبق مل رہا ہے کہ ہمیں ہر حال میں‘ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے لیے محنت کی محبت کو تمام دنیوی محبتوں پر ترجیح دینی چاہیے۔

اس آیت میں ایک طرف آٹھ محبتوں کا تذکرہ آیا ہے‘ جن میں پانچ علائق دنیوی اور تین

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت‘ تنظیم اسلامی

مال واسبابِ دنیوی کی محبتیں ہیں‘ اور پھر ان آٹھ کے مقابلے میں تین محبتوں کا بیان ہے۔ یہ موازنہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ٹٹولیں کہ ہمارے دلوں میں کون سی محبتیں غالب ہیں۔

سب سے پہلے زیر مطالعہ آیت اور اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ دادا‘ تمہارے بیٹے‘ تمہارے بھائی‘ تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘ تمہارے رشتے دار‘ اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں‘ اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو‘ اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں‘ (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ‘ اس کے رسول (ﷺ) اور اس کے راستے میں جہاد سے‘ تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

مرغوباتِ دنیا بمقابلہ اللہ‘ رسولؐ اور جہاد

سب سے پہلے ہم آیت کے پہلے جزو کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں محبوبات و مرغوباتِ نفس اور اس کی لطیف نفسیاتی ترتیب کا بیان آیا ہے۔ باپ‘ بیٹے‘ بھائی‘ بیوی (اور بیوی کے لیے شوہر) اور خاندان کی محبت راہِ حق میں آزمائش ہیں۔ ان کی محبت میں ڈوب کر انسان اللہ تعالیٰ کے دین کے احکامات کو فراموش کر دیتا ہے۔ اموال‘ کاروبار اور مکانات مذکورہ بالا متعلقین ہی کے تعلق سے مطلوب و مرغوب ہوتے ہیں۔ انسان اپنے متعلقین کی دنیا سنوار رہا ہو‘ لیکن دین سے غفلت برت رہا ہو تو اسبابِ دنیا فتنہ بن جاتے ہیں۔

اس حوالے سے یاد رکھیں کہ روزِ قیامت یہ متعلقین انسان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ سورۃ الممتحنہ میں ارشاد ہوا: ﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ (آیت ۳) ’’ہرگز کام نہ آئیں گے روزِ قیامت تمہارے رشتے دار اور نہ تمہاری اولاد‘‘۔ سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهٖ

وَاَخِيْهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ ﴿١٣﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿١٤﴾﴾ ’’مجرم چاہے گا کہ اس دن فدیے میں دے دے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹے‘ بیوی‘ بھائی اور اس پورے خاندان کو‘ جس نے اسے پناہ دی تھی‘ اور زمین میں تمام بسنے والوں کو‘ پھر اپنے آپ کو چھڑا لے‘‘۔ محض یہ خونی رشتے کام آنے والے نہیں ہیں جب تک ان رشتوں کو صحیح رخ پر نہ ڈھالا جائے اور ایمان کا touch ان رشتوں میں شامل نہ کیا جائے۔

زیر مطالعہ آیت میں باپ‘ بیٹے‘ بھائی‘ بیوی اور خاندان کی محبت کے علاوہ مال‘ تجارت اور گھر کی محبت کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس مال کو آدمی نے خود کمایا اور بڑھایا ہو وہ اس کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی طرح کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہی ہے جس کے لیے تاجر کو ہر وقت کساد بازاری کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ مزید یہ کہ گھر کی محبت نے بھی آدمی کو جکڑا ہوا ہوتا ہے‘ اس کا آرام و سکون اس کے لیے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ گھر بنانا غلط نہیں ہے‘ مگر گھر میں ایسے گھر جانا کہ اللہ کے احکامات فراموش ہو جائیں‘ یہ بات غلط ہے۔

یہ وہ آٹھ مرغوباتِ دنیا ہیں جو بت بن جاتی ہیں۔ اگر یہ اللہ‘ اس کے رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں ہجرت و جہاد کی محبت پر فائق ہو جائیں تو انسان فسق و فجور میں پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا جب تک بندہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ان میں سے ہر بُت کو توڑنے کے لیے تیار نہ ہو جائے‘ وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے کہ کسی چیز کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ محبوب ہو جانے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طرف ان مرغوباتِ نفس کے مطالبات ہیں اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مطالبات۔ اب جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مطالبات پر ان چیزوں کے مطالبات کو ترجیح دینے لگ جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مقابلے میں محبوب تر جانا۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حوالے سے سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اے ایمان والو! اپنے معاملات کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے نہ بڑھاؤ‘‘۔ اب جو شخص اس مطالبے کو نظر

انداز کر کے دوسری چیزوں کے مطالبے کو ترجیح دے گا تو گویا اس کے نزدیک یہ چیزیں زیادہ محبوب ہیں اور وہ انہیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے مقدم کر رہا ہے۔

مرغوبات اور محبوباتِ نفس اور ان کے مطالبات کو جاننا بھی ضروری ہے۔ ان کے بارے میں مختصراً جان لیجیے کہ اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ انسان اپنے بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنے میں لگا رہے اور دینی فرائض کو فراموش کر کے حرام ذرائع اختیار کر لے۔ اسی طرح کاروبار کو ترقی دینے کے لیے توانائیوں کا اکثر حصہ اسی کی خاطر صرف کر دے یا خلافِ شرع امور اختیار کرے۔ مال کے حصول کی خاطر دینی ذمہ داریوں سے غفلت برتتے ہوئے حلال و حرام کی تمیز ختم کر دے۔ گھر کی تعمیر اور سجاوٹ ہی میں اکثر وسائل صرف کر دیے جائیں یا سودی قرضوں کے ذریعے اس کی تکمیل کی جائے۔ دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا مطالبہ یہ ہے کہ رشتے داروں، کاروبار، گھر وغیرہ کے لیے جائز ذرائع و وسائل فراہم کیے جائیں اور دینی تقاضوں کی ادائیگی کی جدّوجُہد سے ہرگز غفلت نہ برتی جائے۔

ایک اور انداز سے آپ کے سامنے بات رکھنے کی کوشش کروں گا جو ایک ترازو کی مثال ہے۔ اس درس کو سنتے ہوئے ہمیں اپنے باطن میں ایک ترازو آویزاں کرنا چاہیے۔ ترازو کے دو پلڑوں میں ایک طرف آٹھ محبتیں اور دوسری طرف تین محبتیں ڈال لیجیے۔ پہلے پلڑے میں باپ دادا، بیٹوں، بھائیوں، بیویوں، رشتے داروں، مال، تجارت اور گھر کی آٹھ محبتیں ہیں اور دوسرے پلڑے میں اللہ، رسول ﷺ اور جہاد کی تین محبتیں ہیں۔ اب ہم اپنے باطن کے ترازو میں جھانک کر دیکھیں کہ کون سا پلڑا بھاری ہے۔ اگر پہلا پلڑا بھاری ہے تو شدید تشویش کی بات ہے اور اگر دوسرا پلڑا بھاری ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کیجیے۔

اللہ، رسولؐ اور جہاد کی محبّت کے تقاضے

اب ہم دین کے حوالے سے تین محبتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی اللہ، اس کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبّت کے تقاضے کیا ہیں۔ انسان میں محبت کی تین سطحیں ہیں جن میں سب سے بلند اللہ کی محبّت ہے۔ یہ طبعی، فطری اور روحانی محبّت پر مشتمل ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵) ''جو لوگ ایمان لائے ان کی شدید ترین محبّت اللہ کے لیے ہے''۔ اللہ کی محبت کا بڑا گہرا تعلق ہمارے مقصدِ تخلیق یعنی عبادت سے ہے۔ سورۃ

الذاریات میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ''اور میں نے تمام انسانوں اور جنوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ عبادت محبّت اور اطاعت کا مجموعہ ہے۔ محبت کے ساتھ عبادت اللہ کو مطلوب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بہت پیارا قول ہے جس میں انہوں نے عبادت کے تین محرکات گنوائے ہیں، یعنی جہنم سے بچنے، جنت کے شوق اور اللہ کی محبت کی وجہ سے عبادت کی جاتی ہے۔ اللہ کی محبّت ایمان کا مظہر ہے۔ ترمذی کی روایت کے مطابق حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ)) ''جس نے محبت کی اللہ کے لیے اور دشمنی کی اللہ کے لیے اور دیا اللہ کے لیے اور روکا اللہ کے لیے، اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔''

اب ہم رسول اللہ ﷺ کی محبّت کی طرف آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی محبّت اللہ کی محبّت کا لازمی تقاضا ہے۔ آپ ﷺ سے محبت کا تقاضا آپ ﷺ کی سنت سے محبّت ہے۔ معروف حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ)) (رواہ الترمذی) ''جس نے میری سنت سے محبّت کی اُس نے مجھ سے محبّت کی اور جس نے مجھ سے محبّت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا''۔ اور آپ ﷺ سے محبّت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے محبّت کی جائے۔ خطبۂ جمعہ میں اکثر یہ حدیث پڑھی جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ)) (رواہ الترمذی) ''جس نے میرے صحابہؓ سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبّت کی وجہ سے ان سے محبّت کی۔''

اب آتے ہیں جہاد فی سبیل اللہ کی محبّت کی طرف۔ اللہ کی راہ میں جہاد کی ایک صورت منکرات اور اللہ کے احکام سے بغاوت کے خلاف جہاد ہے، جو اللہ سے محبّت اور غیرت و حمیت کا تقاضا ہے۔ مزید یہ کہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے کوشش کرنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبّت کا عملی ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دین صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے نہیں دیا، بلکہ اسے غالب کرنے کے لیے دیا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھے گا وہ دین کی تعلیمات پر خود بھی عمل کرے گا اور اس کے اجتماعی احکامات کے نفاذ کے لیے بھی جدّوجُہد کرے گا۔

زیر درس آیت کے آخر میں دل کو ہلا دینے والی دھمکی آئی ہے کہ اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ کی طرف سے سزا کے منتظر رہو! اللہ کے حکم سے مراد عذاب کی کوئی صورت یا موت ہے۔ برے انسان کی موت بھی بڑی حسرت ناک ہوتی ہے اور عذاب کی صورت میں واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی بری موت سے حفاظت فرمائے۔ آخری بات یعنی نافرمانوں کے تعلق سے یہ ہے کہ ایسے لوگ دنیوی محبتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اللہ کے باغی ہیں اور ان کی سزا ان کا اللہ کی ہدایت کی نعمت سے محروم ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے‘ آمین!

جہاد وقتال کا مقصد: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

اب ہم سورۃ الصّف کی روشنی میں ’’جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا مقصد‘‘ کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ جہاد وقتال کیوں لازم کیے گئے اور جہاد کی اعلیٰ ترین سطح کیا ہے‘ ان کی تفصیلات سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں ہمارے سامنے آئیں گی۔ سب سے پہلے سورۃ الصّف کی آیات کا مختصر تجزیہ کرتے ہیں۔ سورۃ الصّف کی آیات ۱ تا ۴ میں غلبۂ دین کے لیے دعوتِ جہاد ترہیب کے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ آیات ۵ تا ۸ میں تاریخ بنی اسرائیل کے تین ادوار کا بیان ہے۔ آیت ۹ اس سورت کی مرکزی آیت ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت یعنی غلبہ دین کا ذکر ہے۔ آیات ۱۰ تا ۱۳ میں غلبہ دین کے لیے جہاد کی دعوت ترغیب کے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ آیت ۱۴ میں غلبہ دین کے لیے جہاد کرنے والوں کے لیے عظیم سعادت کا تذکرہ ہے۔

آج ہم آیت ۹ پر گفتگو کریں گے۔ پہلے اس آیت کی اہمیت سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو بھیجے جانے کے مقصد یعنی غلبۂ دین کا بیان ہے۔ زمین اللہ کی ہے اور اس پر سب بڑا حق اللہ کا ہے‘ لہٰذا اس پر اللہ کا حکم ہی نافذ ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے ہمارے سامنے مختلف احادیث آتی ہیں۔ کہیں فرمایا گیا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) (رواہ احمد) ’’مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کر دوں‘‘۔ کہیں ارشاد ہوا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) ’’مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے‘‘۔ کبھی آپ ﷺ کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ آپ ﷺ قرآن کریم کی آیات کی تلاوت فرماتے ہیں‘ تزکیہ فرماتے ہیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ کبھی یہ بھی ذکر ہوا کہ آپ ﷺ نیکی کی تلقین کرتے اور بدی سے روکتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ کے بھیجے جانے کا اعلیٰ ترین مقصد غلبۂ دین یعنی اللہ کی زمین پر

اللہ کے دین کا نفاذ ہے۔ آپ ﷺ پر نبوت نہ صرف ختم ہوئی‘ بلکہ مکمل بھی ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء بھی ہیں اور آپ پر دین کی تکمیل کا اعلان بھی ہوا‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ (المائدۃ:۳) ’’آج کے دن ہم نے آپ (ﷺ) کے لیے آپ کا دین مکمل فرما دیا‘‘۔ سلسلۂ رسالت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا وہ نبی اکرم ﷺ پر ختم ہوا اور اس کی تکمیل بھی ہو گئی۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت پورے قرآن کے لیے مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ پورا قرآن کم وبیش ۲۳ سال میں نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی نبوی زندگی بھی ۲۳ سال پر محیط ہے۔ نبوی زندگی میں کون سی جدّوجُہد ہو رہی تھی اس کا بیان اس آیت میں آیا ہے۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہ قرآن میں تین مرتبہ یعنی سورۃ التوبہ‘ آیت ۳۳‘ سورۃ الفتح‘ آیت ۲۸ اور سورۃ الصّف کی آیت ۹ میں نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کا ذکر انہی الفاظ میں آیا ہے۔

سورۃ الصّف کی آیت ۹ کی طرف آتے ہیں‘ جس میں ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ ’’وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو کامل ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ وہ اس کو غالب کر دیں کل نظام ہائے زندگی پر اور چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے‘‘۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا مشن ہے۔ پہلی بات یہ کہ رسالت آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر آ کر پورے نوعِ انسانی کی طرف درجۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ مختلف انبیاء ورسل علیہم السلام کی بڑی پیاری صفات بیان ہوتی ہیں‘ مثلاً آدم صفیُ اللہ‘ نوح نبیُ اللہ‘ موسیٰ کلیمُ اللہ‘ عیسیٰ روحُ اللہ.... اور محمد رسول اللہ۔

اگلی بات یہ کہ قرآن کریم اپنے لیے بار بار ’’ہدایت‘‘ (ھُدًی) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ انسان آہستہ آہستہ فکری بلوغت کی منازل کو طے کرتا ہوا نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے دور میں عقل وشعور کی پختگی اور ذہنی ارتقاء کی آخری منزل کو پہنچ گیا۔ تاریخ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے مختلف کتابیں نازل فرمائیں مگر آخری کتاب قرآن کو قرار دیا اور خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اس کے علاوہ کسی اور کتاب کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا‘ اس لیے کہ اس میں بتمام وکمال ہدایت عطا کر دی گئی اور اب انسان کو مزید کسی ہدایت کی ضرورت نہیں رہی۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ پہلی جماعت کے بچے کو پانچویں جماعت کی کتابیں

نہیں پڑھائی جاتیں۔اسی طرح پانچویں جماعت کے بچے کو دسویں جماعت کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں اور دسویں جماعت کے طالب علم کو یونیورسٹی لیول کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ بچے کا بتدریج ذہنی ارتقاء ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی تعلیم کا نصاب تیار ہوتا ہے۔اسی طرح ساری انسانیت کا بھی ذہنی ارتقاء ہوتا چلا گیا۔غور وفکر اور فلسفے سے انسان پیچیدہ ترین باتوں پر غور وفکر کے قابل ہوتا چلا گیا۔جب انسان اس قابل ہو گیا کہ زندگی کے پیچیدہ ترین معاملات کے شعور کی انتہا کو پہنچ گیا تو اس کے لیے آخری کتابِ ہدایت قرآن حکیم کی صورت میں حضور اکرم ﷺ کو عطا کر دی گئی۔

اگلی چیز جو نبی اکرم ﷺ کو عطا فرمائی گئی وہ دِیْنِ الْحَق ہے۔دین کا لغوی مفہوم بدلہ ہے۔اصطلاحی مفہوم ہے قانون' ضابطہ' نظام اور اطاعت۔ واضح رہے کہ بدلہ کسی قانون اور ضابطے کے تحت ہوتا ہے' قانون کسی نظام کے تحت ہوتا ہے اور نظام واقعتاً وہی ہے جس کی اطاعت کی جا رہی ہو۔اللہ تعالیٰ نے اپنا نظام اس لیے دیا کہ اسے قائم کیا جائے' کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد بعثت ہے۔اگر اللہ کا نظام قائم نہیں ہوگا تو شیطان کا نظام چل رہا ہوگا۔دین حق سے مراد حق کا دین ہے۔چونکہ اللہ ہی حق ہے لہٰذا مفہوم اللہ کا دین ہوا۔نبی اکرم ﷺ کے دور میں انسان نے تمدنی ارتقاء کے عروج تک رسائی حاصل کر لی۔جب انسان شعور کی بلوغت کو پہنچا تب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید دیا۔ایسے ہی انسان کا تمدنی ارتقاء (social evolution) بھی ہوا ہے۔کبھی انسان غاروں میں رہتا تھا۔سادہ زندگی اور سادہ معاملات تھے۔کبھی اس نے دریاؤں اور سمندروں کے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں بنائیں تو معاشرہ بنتا چلا گیا۔کچھ اور احکامات ملتے چلے گئے۔کبھی قبائلی زندگی تھی تو اگلی سطح کے احکامات عطا ہوئے۔جب رسول اللہ ﷺ کا دور آیا تو تمدن کا ارتقاء اپنی عروج کو پہنچا اور انسان ریاست کے تصور سے بھی واقف ہو گیا۔جب زندگی کے پیچیدہ مسائل بھی سامنے آئے تو اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل فرما دیا اور اپنے عطا کردہ نظام کے حوالے سے تعلیمات مکمل فرما دیں۔

اگلی بات لِیُظْهِرَهٗ ہے جو ایک دلچسپ لفظ ہے۔اس کے چار معنی بیان ہو سکتے ہیں۔ (۱) اللہ غالب کر دے دین حق کو' (۲) رسول ﷺ غالب کر دیں دین حق کو' (۳) اللہ غالب کر دے اپنے رسول ﷺ کو' یا (۴) رسول ﷺ غالب کر دیں اللہ کو۔عربی اسلوب کے

اعتبار سے یہ چاروں معانی ممکن ہیں مگر اس سب کے حوالے سے ایک ہی حاصل ہمارے سامنے آتا ہے۔عالَمِ واقعہ میں یہ کام رسول اللہ ﷺ نے کرنا تھا اور عالَمِ حقیقت میں اللہ نے' یعنی اللہ کو غالب کرنے سے مراد اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔اللہ غالب کر دے تو عالَمِ اسباب کے تحت یہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھوں ہوگا اور عالَمِ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی یہ کام کر رہے ہوں گے۔اس سب کا حاصل یہی ہے کہ زمین پر اللہ کا دین غالب ہو جائے جس کے لیے محنت رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں اور توفیق اور تائید اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات بابرکات فرما رہی ہے۔

اب اگلی بات عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہے۔قرآن وحدیث کے وسیع ذخیرے میں اسلام کے لیے مذہب کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی' ہمیشہ دین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف انفرادی زندگی سے ہوتا ہے' جبکہ دین کا تعلق انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں سے ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دین کے طور پر عطا کیا۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔پھر یہ کہ آپ ﷺ نے ۲۱ برس کی سخت جِدّوجُہد کے ذریعے رہتی دنیا تک ایک مثالی نظام قائم کر کے اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔۹ ہجری کو عام الوفود کہتے ہیں جب عرب کے پورے علاقوں سے وفود آئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔

الغرض یاد رکھیے کہ نبی اکرم ﷺ کا مشن محض وعظ ونصیحت اور درس وتدریس نہ تھا' بلکہ انقلابی تھا جس کا مقصد نظامِ باطل کو جڑ سے اُکھاڑنا اور اس کی جگہ نظامِ عدل کو قائم فرمانا تھا۔یہ دین محض نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا ہی تقاضا نہیں کرتا' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر معاشرت' معیشت' سیاست' عدالت' حکومت وریاست میں اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا مقصد بھی یہی ہے۔سورۃ الصّف کی بقیہ آیات میں مختلف اسالیب سے غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کے لیے مال اور جان لگانے کی دعوت دی جا رہی ہے تاکہ اس مشن کے لیے جماعت تیار کی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں جہاد وقتال کے صحیح تصوّر کو سمجھ کر اس پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

دین اور فریضۂ دینی

سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں

محمد فہیم (لوئر دیر)*

دنیا کے سب سے عظیم انسان، سردارِ کونین، فخرِ انبیاء، آخر الرسل محمدؐ رسول اللہ ﷺ (فداہ آباؤنا و اُمّھاتنا) ماہِ ربیع الاول میں دُنیا میں تشریف لائے اور ۶۳ سال (قمری) کی عمر میں اسی مہینہ میں پردہ فرما کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ آپ ﷺ بلاشبہ انسانیت کے محسنِ اعظم ہیں کہ آپ ﷺ نے قافلۂ انسانیت کو گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر روشن شاہراہ پر گامزن فرمایا اور انسانیت کی فلاح ونجات کے لیے خود جان گُسل تکالیف برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں ہر چیز کی قربانی دے کر انسانیت کے لیے سنگ ہائے میلِ ہدایت نصب فرمائے۔ آنحضور ﷺ کی شان میں جتنا بھی رطب اللّسان ہوا جائے، اس کا حق ادا کرنا ناممکن ہے، لیکن ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اُمتی ہونے کے ناطے یہ سوچ بچار تو کرنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے ہمیں جو ''دین'' عطا فرمایا ہے اس کے تقاضے کیا ہیں اور اس ضمن میں ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کی اصل نوعیت کیا ہے! یہ جاننے کے بعد اس ''فریضۂ دینی'' کے لیے کمر ہمت باندھ کر سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روشنی میں اس پر عمل کرنا ہی ہمارا اصل فریضہ ہے۔

دین کے تقاضوں اور اس فریضہ دینی کے بارے میں جاننے سے پہلے چند تمہیدی باتیں نوٹ کر لیجیے:

(۱) اللہ ایک ہے، اکیلا ہے، وہ رب ہے، خالق ہے، مالک ہے، وہ الحی القیوم ہے۔ اس کی ذات و صفات ذاتی اور قدیم ہیں۔ نہ کوئی اُس کی ذات میں شریک ہے، نہ صفات میں، نہ عبادت میں اور نہ دعا میں۔ ہمارا ذہن اور تصورذاتِ باری تعالیٰ کا کسی بھی درجہ میں احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ وراء الوراء

* نائب ناظم نشر واشاعت، تنظیم اسلامی

ہے۔ وہ ہر کام پر ہر وقت قادر ہے اور وہ اسباب کا محتاج بھی نہیں ہے۔ اُس کے حکم اور اِذن کے بغیر ایک پتّا بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، وہ باریک بین ہے اور سینوں کے حالات سے بھی باخبر ہے۔

(۲) خالق صرف ایک اللہ ہے اور باقی ہر چیز اُس کی مخلوق ہے۔ مخلوقات میں اُس کی شاہکار مخلوق انسان ہے جو جسم اور روح کا مرکب ہے۔ روح کی نسبت باری تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ (الحجر:۲۹ و صٓ:۷۲) ''پھر جب میں ٹھیک کر دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے تو گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے''۔ پھر اس تخلیق کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جن وانس کو اپنی بندگی ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ بنی نوع انسان کو محدود آزادی دی تاکہ ذاتِ باری تعالیٰ جانچے کہ وہ دنیوی زندگی میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ (الملک:۲) ''وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون احسن عمل کرتا ہے''۔ اسی طرح سورۃ الدہر میں فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ﴾ (الدھر) ''یقیناً ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں پس اسے سمیع اور بصیر بنایا''۔ لہٰذا یہ دنیوی زندگی ایک امتحان گاہ ہے، جبکہ اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی: ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (العنکبوت) ''اور نہیں ہے یہ دنیا کی زندگی مگر لہو ولعب ہے۔ اور دارِ آخرت ہی اصل زندگی ہے، کاش یہ لوگ جان جاتے!'' اُس لامحدود زندگی کا دار و مدار اِس محدود زندگی میں انسان کے رویے اور طرزِ عمل پر ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب سے دوچار کر دے گا۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ اپنے فیصلوں میں مختارِ مطلق ہے اور وہ کسی کام پر مجبور نہیں ہے۔

(۳) انسان کو مختلف استعدادات اور صلاحیتوں سے آراستہ کر کے دار الامتحان میں بھیجا گیا ہے۔ اسے ربّ ذوالجلال عقل وشعور، وجدان، محبت، جذبۂ شکر، احساس، سوچ وفکر، ذہن وقلب اور حواسِ خمسہ سے مزیّن کر کے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ یہاں اصل مالک کی

مرضی کے مطابق خود بھی زندگی گزارے اور اس کی مرضی اور احکام کی تنفیذ کے لیے جدّوجُہد (جہاد) بھی کرے۔ ان استعدادات کی بنا پر انسان مکلّف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بحیثیت رب پہچانے‘ مگر اللہ ربّ العزت نے مزید احسان‘ قطع عذر اور اتمامِ حجّت کے لیے بذریعہ سلسلہ انبیاء ورسل علیہم السلام وحی کا اہتمام فرمایا اور زندگی گزارنے کی تمام تفصیلات وحی کے ذریعے بتادی گئیں‘ تاکہ کل انسان یہ نہ کہہ سکے کہ یااللہ! مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے‘ تیری مرضی کیا ہے؟ اس بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ ’’بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع باقی نہ رہے۔ اور اللہ زبردست‘ حکمت والا ہے۔‘‘

(۴) اللہ تعالیٰ نے انسان کے سر پر خلافت کا تاج رکھ کر زمین پر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اسے دو قسم کے علوم سے نوازا۔ ایک علم الابدان‘ جو اسے بالقوہ سکھایا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَاۗءِ هٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ) ’’اور سکھلائے آدمؑ کو اللہ نے سب چیزوں کے نام‘ پھر سامنے کیا فرشتوں کے اور کہا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو‘‘۔ یہ علم الابدان کُل انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے‘ لہٰذا انسان کسب کر کے ان علوم کو حاصل کر سکتا ہے۔ آج بھی جو ان پر محنت کرے گا‘ بقدرِ محنت حصہ پا کر مستفید ہوگا۔ یہ علم کا وہ خزانہ ہے جس کے ذریعے انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں انکشافات‘ معلومات اور ایجادات کے انبار لگا کر ستاروں پر کمند ڈالنے کی راہ نکالی ہے۔ علم کا یہ شعبہ بلاامتیاز ہر کسی کے لیے کھلا ہے‘ خواہ وہ اللہ کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو‘ آخرت پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو‘ وحی اور سلسلہ نبوت پر ایمان لاتا ہو یا نہ لاتا ہو۔ علم الابدان کی حد تک اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی امتیاز کے اپنے خزانوں کے دروازے کھول رکھے ہیں۔

(۵) دوسرا علم‘ علم الادیان ہے جس کا سرچشمہ ذاتِ ربانی اور وحیٔ خداوندی ہے‘ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعے اپنے بندوں تک پہنچانے کا بندوبست فرمایا۔ ہدایت خداوندی کا آخری‘ ابدی اور مکمل ایڈیشن قرآن کریم ہے‘ جو سید المرسلین‘ خاتم النبیین‘ محبوبِ ربّ العالمین‘ ختم المرسلین جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا ہے۔ انسان اس قرآن کی بنا پر مکلّف ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح راہ کا تعین کر کے اس راہ پر چلنے کی کوشش

کرے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہے۔ قرآن اللہ ربّ العزت کا آخری اور مکمل پیغام ہے‘ اس لیے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر) ’’ہم نے خود یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں‘‘۔

قرآن کریم کے متعلق ہمارے عقیدے کے تین اصول بنیادی اہمیت کے حامل ہیں‘ جو ہر وقت مستحضر رہنے چاہئیں: (i) قرآن اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ (ii) یہ حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بواسطہ جبریل امین علیہ السلام نازل ہوا ہے۔ (iii) یہ تاابد اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

قرآن حکیم کے بارے میں ایک اور بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ قرآن کو اصطلاح میں وحی متلو کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وحی غیر متلو بھی ہے جو صحیح احادیث کی صورت میں محفوظ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فرمودات اللہ ہی کی طرف سے ہوتے تھے۔ مولانا رومیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود اگرچہ از حلقومِ عبداللہ بود!

(۶) اسلام صرف مذہب ہی نہیں‘ بلکہ ایک مکمل ’’دین‘‘ اور ضابطہ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کے لیے مکمل بنیادی رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کی مکمل تشریح وتعبیر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سفر قرآن کی روشنی میں شروع کر کے مکمل کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی زندگی کی قرآن کی روشنی میں جو تشریح فرمائی وہ اسلام کی بنیادی اصطلاح ’’عبادت‘‘ ہے۔ اسی عبادت کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں جن وانس کا مقصدِ تخلیق بیان فرمایا ہے۔ مزید برآں‘ اسی عبادت کے تقاضے آگے چل کر شہادت علی الناس اور اقامت دین جیسی اصطلاحات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

دین کے اہم تقاضے

اسلام بحیثیتِ دین اپنے ماننے والوں سے جو تقاضے کرتا ہے‘ ذیل میں ان کو ترتیب وار بیان کیا جا رہا ہے:

(۱) **عبادتِ ربّ**: اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم مکمل عبدیت اختیار کریں اور تسلیم ورضا اور محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کے آگے بچھ جائیں۔ ہماری زندگی ہمہ وقت‘ ہمہ تن‘ ہمہ جہت اور ہمہ

صفت اللہ ہی کی مرضی کے مطابق گزرے۔ اسی ''عبدیت'' کو انفرادی طور پر مطلوبہ شکل میں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ''عبادات'' کا ایک نظام ہمیں عطا فرمایا ہے یعنی کلمہ طیبہ کے بعد نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ۔ ان فرض عبادات کا مفاد یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہم بطریق احسن ''عبادتِ رب'' کو انجام دے سکیں اور ان عبادات کی ادائیگی سے تازگی اور تقویت حاصل کرتے رہیں۔

(۲) شھادت علی النّاس: دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اس عبادت کے لیے لوگوں کو ہم اللہ ربّ العزت کی طرف بلائیں۔ یہ عبادتِ رب ایک عظیم خیر ہے' لہٰذا ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کو اس میں شریک کرنے کی جدّوجُہد کریں۔ ایک تو انسانیت کے ناطے ہم میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جس چیز کو ہم خیر تسلیم کرتے ہیں اس میں اپنے ابنائے نوع کو بھی شریک کریں اور ازروئے قرآن بحیثیت اُمتی یہ ہمارا فرض بھی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمتِ وَسَط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو''۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آیت ۱۰۴) ''اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم کرتی رہے اور برائی سے منع کرتی رہے''۔ اسی طرح آیت ۱۱۰ میں فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو' اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔''

(۳) اقامتِ دین: عبادتِ رب اور شہادت علی الناس کے بعد تیسرے فریضہ کو قرآنی اصطلاح میں اقامتِ دین' اظہارِ دین' غلبۂ دین اور لسانِ نبوت میں لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا کا نام دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت عالمی سطح پر سیکولرازم اس حد تک مسلّط ہو چکا ہے کہ اہلِ ایمان کی طرف سے اقامتِ دین یا دین کی بالادستی اور اس کی حکمرانی کے لیے جدّوجُہد پس منظر میں چلی گئی ہے۔ ہمارے ہاں بھی سیرت النبی ﷺ کی اکثر مجالس میں حضور ﷺ کی عظمت' آپؐ کے اخلاقِ عالیہ' آپؐ کے حلم و بردباری' آپؐ کے شمائل شریف اور آپؐ کے پاکیزہ اخلاق پر تو الحمدللہ سیر حاصل گفتگو ہوتی رہتی ہے' مگر اقامتِ دین کے لیے آپ ﷺ کی

ان تھک جدوجہد اور قربانیوں پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

قرآن کریم گواہ ہے کہ حضور ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا سب سے نمایاں اور مشقت طلب پہلو غلبہ و اقامتِ دین کے لیے جدّوجہد ہی تھی اور اس ذمہ داری کو قرآن پاک نے بہت زیادہ نمایاں کیا ہے' جیسے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸ اور الصف:۹) ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غالب کر دے تمام ادیان پر''۔ اس آیت کو کسی شوشے کے فرق کے بغیر قرآن کریم میں تین مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں جن سے حضور نبی اکرم ﷺ کی اقامت دین کے لیے ذمہ داری بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ سیرت النبی کے عنوان سے ہونے والے اکثر اجتماعات میں بندگیٔ رب کے حوالہ سے نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا ذکر تو ہوتا ہے' لیکن غلبہ دین کے لیے جدّوجہد کے متعلق کوئی مربوط بیان شاذ ہی سننے کو ملتا ہے۔ گویا اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ عبادات کرنا اور ان کے لیے دعوت دینا ہی کافی ہے اور اسی کو کُل دین سمجھ لیا گیا ہے کہ اس طرح تمام لوگ نمازی اور روزہ دار بن جائیں گے اور معاشرہ خود بخود پورے کا پورا ٹھیک ہو جائے گا۔ ان عبادات کی اہمیت سے انکار تو ممکن ہی نہیں مگر سیرت النبی ﷺ تو یہی سکھاتی ہے کہ کل کا کل کام یہ نہیں' بلکہ آگے بڑھ کر اقامت دین کی جدّوجہد لازم اور ناگزیر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں گہرائی میں اُتر کر سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کر کے اس کے اصل پیغام کو سمجھنا ہوگا۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فریضۂ اقامتِ دین' غلبۂ دین یا اظہارِ دین کو نظرانداز کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ آج کی دنیا سیکولر نظریات کے نرغے میں ہے اور ستاون اسلامی ممالک کے ہوتے ہوئے بھی کسی ایک خطہ ارضی پر بھی اللہ کے دین کو غلبہ حاصل نہیں ہے۔ سیکولرازم' مادہ پرستی اور الحادی نظریات کا غلغلہ اور طنطنہ ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس طرف متوجہ ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کا خصوصی مشن ہی یہ تھا کہ آپؐ اللہ کے دین کو غالب کر کے اسے اُمت کے لیے ایک نمونہ بنا کر گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے اہلِ علم' مبلّغین' مدرّسین' واعظین' خطبائے کرام اور دین کے خدمت گاروں کو کمر ہمت باندھ کر اس فریضہ کو اپنی دعوت و تبلیغ' درس و تدریس' تعلیم و تعلّم کا مرکزی موضوع بنانا چاہیے۔ یہ ہے آج کرنے کا اصل کام جس سے بدقسمتی سے

بے اعتنائی اختیار کی گئی ہے۔

اقامتِ دین کے ضمن میں چند معروضات: اقامت دین کے حوالے سے غلط فہمی کا ازالہ کرنے اور اس نکتہ کو مزید واضح کرنے کے لیے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

اسلام اپنی فطرت کی بنیاد پر بحیثیت ''دین'' اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر دین اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر (خواہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے) اپنی حکمرانی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ماقبل بیان کر دیا گیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان اور آپؐ کی رسالت کا مقصدِ اعظم ہی دین اسلام کو باقی ادیان پر غالب کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے بحیثیت آخری نبی اور رسول تشریف لا کر دین کی تکمیل فرما دی اور اسے ایک بالادست نظام کی شکل میں غالب فرما کر ایک نمونہ کے طور پر انسانیت کے سامنے پیش کر کے حجت قائم کر دی۔

تمدنی ارتقاء کے فلسفہ کے حوالے سے اگر ہم انسانی زندگی پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے جب انسان ایک فرد کے طور پر انفرادی زندگی گزار رہا تھا اور اس کی کوئی اجتماعیت نہیں تھی، وہ اکیلا کسی غار یا پہاڑی کے ٹیلے پر بیٹھا رہتا تھا، تو اُس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اپنے خالق و مالک کا ادراک کر کے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر لے۔ لیکن آگے چل کر جب اس کی زندگی اجتماعیت کا جزو بن گئی تو اب اسے ایک ضابطہ، مجموعہ قوانین اور اجتماعی نظام کی ضرورت پڑی، اور اب وہ مجبور ہے کہ ان مروّجہ اصول وضوابط کے تحت زندگی گزارے۔ قابل فہم بات یہ ہے کہ اگر یہ اجتماعی نظام غیر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ طاغوتی اور ظالمانہ ہے، بے خدا ہے، غیر معتدل ہے، سیکولر اور الحادی ہے۔ اور اگر ایک ''بندۂ خدا'' اس نظام کی چھتری تلے اطمینان کے ساتھ پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، اسے اس نظام سے کوئی کراہیت محسوس نہیں ہوتی، اسے اس کو ہٹانے کی کوئی فکر نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر خوش اور راضی ہے، جبکہ اللہ کے رسول ﷺ ایسے ہی ایک بے خدا نظامِ اجتماعی کو تلپٹ کرنے اور اس کی جگہ اللہ کا نظامِ عدل وقسط برپا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے اور آپؐ نے ایسا کر کے دکھایا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک بے خدا اجتماعی نظامِ زندگی میں ''بندگیٔ رب'' کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے؟ آج اگر اجتماعیت کے شعبوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ ایک فرد اجتماعیت کے پنجے میں کس قدر مضبوطی کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔ آیئے ہمارے انفرادی

اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں پانچ بڑے دائروں کے اندر مختلف شعبہ جات کا صرف نام لے کر دیکھیں کہ انسانی زندگی کس طرح اجتماعیت کے اندر پھنس کر رہ گئی ہے ـــــ فرد اس جال میں اس طرح پھنسا ہوا ہے جیسے ایک مکھی مکڑی کے جال میں آ کر پھنس جائے۔ پھر یہ مکھی اس جال سے نکلنے کے لیے جس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے اتنا ہی مزید دھنستی جاتی ہے۔ یہی مثال آج کے انسان کی ہے کہ اس کے اوپر نظام کا جو خیمہ ہے وہ غیر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ انسان مجبور ہے کہ اس طاغوتی نظام کے تحت زندگی گزارے۔ آیئے ان پانچ دائروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(۱) عبادات: کلمہ توحید (عقیدہ) نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ۔

(۲) اخلاقیات: سچ، خوش کلامی، نرمی، حلم، بردباری، صبر وشکر، تواضع وخاکساری، دریا دلی، عدل و انصاف، ایثار، استقامت، استقلال، خودداری، عفت و پاکبازی، بہادری، شرم وحیا، توکّل و تقویٰ وغیرہ۔

(۳) معاشرت: نکاح وطلاق، رضاعت، مہر، حقوقِ زوجین، والدین، ذوی القربیٰ، پڑوسی، محلہ، شہر، ملک، جانور، ماحولیات وغیرہ۔

(۴) معاملات: تجارت، شراکت، مضاربت، رہن، وصیت، وراثت، قرض، امانت، عاریت، اجارہ، زراعت، صنعت، لین دین وغیرہ۔

(۵) اسلامی ریاست: امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، نظامِ قضا، عدالتیں، امن وامان، امورِ داخلہ، پولیس، خزانہ، خارجی امور، فوج ودفاع، جہاد، سفارت، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ۔

اب ذرا ان شعبوں کو دیکھیں (مزید بھی بہت ہو سکتے ہیں) تو یہ بات خود بخود سمجھ آ جاتی ہے کہ انسان تب عبادتِ رب کا حق ادا کر سکے گا جب یہ اجتماعی نظام بھی مشرف بہ اسلام ہو جائے اور ان شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق چلایا جا رہا ہو۔ ایک سیکولر انسان کہتا ہے کہ اپنی عبادت کرو اور نظام کو مست چھیڑو، یہ انسان کا کام ہے کہ وہ جس طرح چاہے اور جن اصولوں پر چاہے اس کو چلائے۔ اب اگر کوئی صاحبِ علم بھی اسی بات پر اڑا رہے کہ بھائی نظام کی ضرورت نہیں تو پھر وہ بھی سیکولر بات ہی ہوئی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان یہی ہے کہ آپؐ نے اللہ کی حکومت قائم کر کے ایک نظام تشکیل دیا۔

اس بحث کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ جس طرح انفرادی حیثیت میں ایک انسان عبادتِ ربّ پر مکلّف اور مسئول ہے‘ اسی طرح جس نظام کے تحت وہ سانس لیتا ہے اس کے بارے میں بھی وہ مکلّف ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی سی کوشش کرتا رہے۔ اگر تو نظام اللہ کی کتاب اور سنّتِ رسولؐ کے مطابق ہے (جیسا کہ دورِ خلافت راشدہ میں تھا یا کم از کم بعد کی مسلمان حکومتیں تھیں) تو اسے برقرار رکھنے کے لیے تمام عوامل کو بروئے کار لایا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں پر استوار کرنے کی جدّوجہد کی جائے۔ (اس پورے سلسلے کو قیامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نام دیا جاتا ہے۔) یہ جو بیانیہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت سے متعلق منبر و محراب سے بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ نے فرمایا کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ نے زکوٰۃ میں اونٹ کے ساتھ رسّی بھی وصول کی ہو اور اب کوئی شخص اس سے انکار کر رہا ہو تو ابوبکرؓ کی تلوار اس کے خلاف بے نیام ہوگی‘ یہ کس چیز کی نشان دہی کر رہا ہے؟ یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اللہ کے رسول ﷺ کے قائم کیے ہوئے دین میں کسی معمولی چیز کی کمی کے بھی روادار نہیں تھے۔ اب معاملہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نظام کی تبدیلی یا دین کے غلبہ کے لیے کوئی کوشش ضروری نہیں تو یہ بات حضور ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کے عمل (سیرتِ مبارکہ) کے خلاف متصور ہوگی۔ لہٰذا از روئے قرآن عظیم اور سیرتِ نبویؐ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد ہمارا دینی فریضہ ہے۔

(۴) **دعوت**: حضور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں (صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے قرآن کے ذریعے دعوت دی۔ قرآنی مقناطیس کو معاشرہ پر پھرایا اور جو صالح عناصر اس سے چمٹ گئے‘ ان کے دلوں میں ایمان کی حقیقت کو پیوست کر دیا‘ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) ’’اور اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اسے تمہارے دلوں میں پیوست کر دیا‘‘۔ حضور ﷺ نے دعوت کے لیے قرآن ہی کو آلہ اور ذریعہ بنایا اور پھر اس دعوت کے ذریعے حضور ﷺ کو جو افراد (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میسر آ گئے‘ ان کو آپؐ نے ایک جماعت میں منظم کر کے (قرآن و حدیث کی اصطلاح ’’سمع و طاعت‘‘ کی بنیاد پر) ان کی تربیت اور تزکیہ فرمایا۔ قرآن ان کے دلوں میں اتارا اور پھر صبر محض کی بھٹیوں سے گزار کر ان کو کندن بنایا۔

غزواتِ بدر‘ اُحد‘ حنین‘ احزاب‘ تبوک وغیرہ میں باطل کے ساتھ دو دو ہاتھ کے مواقع سامنے آتے رہے تو نتیجتاً حق غالب ہو گیا اور باطل مٹ گیا: ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ حق آیا اور باطل بھاگ نکلا۔ بے شک باطل ہے ہی بھاگنے والا۔‘‘

اس حوالے سے یہ بھی یاد رکھیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمت تمدنی ارتقاء کے اس موڑ پر ہے جہاں یہ دنیا ایک عالمی گاؤں (global village) بن کر سمٹ گئی ہے اور آج اس اُمت کا کوئی بھی فرد کسی طور پر بھی اپنے اوپر مسلّط کردہ نظام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ اس نظام میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں جیسے ایک پرندہ کسی جال میں پھنسا ہوا ہو۔ اگر نظام پر طاغوت کا تسلّط ہے (جیسے کہ بالفعل اس وقت ہے) تو آپ اور ہم لامحالہ اس طاغوتی نظام کے کُل پرزے بنے ہوئے ہیں اور اس صورت میں ’’عبادت‘‘ بھی سورۂ یوسف کی اس آیت کے مصداق بن جاتی ہے: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝۱۰۶﴾ ’’اور نہیں ایمان لاتے بہت سے لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی شرک بھی کرتے ہیں۔‘‘

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر یہ بات ایک مخصوص ایجنڈے کے تحت‘ مغرب اور مغرب زدہ میڈیا کے ذریعے پھیلائی جا رہی ہے کہ اسلام تو بس میٹھے میٹھے وعظ اور اچھے اخلاق کے نتیجے میں پھیلا یعنی اس کے لیے کسی نے خون کی قربانی نہیں دی۔ ایسا فکر یا تو قرآن اور سیرتِ مطہرہ سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہے اور یا حقیقت کو قصداً و عمداً چھپانے کی ایک کوشش ہے۔ یہ بدر‘ اُحد‘ حنین‘ احزاب‘ خیبر‘ تبوک اور دیگر درجنوں غزوات اور سرایا کس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں؟ اصل حقیقت جو سیرت النبی ﷺ سے ظاہر ہو کر سامنے آتی ہے‘ وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دعوت الی اللہ کے ذریعے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ ان کے دلوں میں آیاتِ قرآنی کے ذریعے ایمان کو راسخ کیا‘ ان کو منظّم کیا اور پھر ان کا تزکیہ فرمایا۔ اس کے بعد پہلے مدینہ منورہ اور پھر جزیرۃ العرب کے ایک معلوم اور بڑے حصے پر بنفس نفیس اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کی۔ یہی حزب اللہ کی حکومت تھی جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ اور رسولؐ کے فرمودات کے مطابق رواں دواں ہو گئی۔ چونکہ یہ حکومتِ الٰہیہ تھی‘ لہٰذا اسے حق حاصل تھا کہ اسے مان لیا جائے‘ اسی کی بیعت کی جائے‘ اسی کی اطاعت کی جائے‘ اور اسی

کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ جو بھی طاقت اس خدائی نظام (خلافت) کے خلاف اُٹھنے یا مزاحم ہونے کے جرم کی مرتکب ہوئی تو اسے اسی وقت ہی چیلنج کیا گیا' جیسا کہ مدنی دور کے آغاز میں غزوۂ بدر سے بھی پہلے چند واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً ابوسفیان کے قافلہ کی گزرگاہ کو مخدوش بنایا گیا اور واقعہ نخلہ پیش آیا۔ اس طرح خاموش جھیل میں پتھر پھینک کر تلاطم برپا کیا گیا۔ اس لیے کہ مدینہ میں جائے قرار (base) میسر آنے کے بعد حضور ﷺ اب اللہ کے گھر میں شرک اور گمراہی کو مزید ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ ہی نے پہل کی' قدم اٹھایا اور باطل سے ٹکر لی۔ لہٰذا یہ معذرت خواہانہ سوچ غلط ہے کہ اسلام وعظ وتبلیغ کے نتیجے میں غالب ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام کے غلبہ میں تعلیم وتعلّم' دعوت وتبلیغ' وعظ ونصیحت' رواداری' ہمدردی' صبر ومصابرت وغیرہ نے اپنی اپنی جگہ کام کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بس یہی سب کچھ تھا اور اسلام کے غلبہ کے لیے ایک اہم چیز (جسے قرآن کی رو سے ایمان کے رکن کی حیثیت حاصل ہے) جہاد یعنی قتال فی سبیل اللہ کو ایک طرف رکھ کر نظر انداز کرنے کی جسارت کی جائے۔ اگر اس بیانیے کو مان لیا جائے تو پھر یہ قرآنی سورتیں (البقرۃ' آلِ عمران' النساء' المائدۃ' الانفال' التوبہ' الحجر' الصّف' الحدید وغیرہم) اور سینکڑوں متفرق آیاتِ کریمہ کس موضوع سے بحث کرتی ہیں اور کس کام کی ترغیب دیتی ہیں؟ فاعتبروا یااولی الابصار!

آج کیا اور کیسے کرنا ہے؟

اس وقت کے حالات کے تقاضوں کی رو سے یہ اہم ترین سوال ہے اور اس کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ختم نبوت کے منطقی نتیجہ کے طور پر کارِ رسالت کا فریضہ اب اُمت ہی کے ذمہ ہے۔ اُمت ہی نے دعوت کے ذریعے لوگوں کو اللہ ربّ العزت کی طرف بلا کر ایک حزب اللہ تشکیل دینی ہے اور پھر تعلیم وتربیت کر کے اسے سمع وطاعت کا خوگر بنانا ہے۔ یہ جماعت جزوی نہیں بلکہ ''پورے دین'' کی دعوت دیتی رہے گی۔ اس دعوت وپیغام کا لُبِّ لُباب یہ ہوگا: ''خود اللہ کے بندے بنو' اللہ کی طرف دعوت دو' اور اللہ کے دین کی اقامت' غلبہ اور اظہار کے لیے جدّوجہد کرتے رہا کرو' یعنی ایسے نظامِ اجتماعی کو بحال کرنے کی جدّوجہد میں لگ جاؤ جس میں صرف اللہ کی کتاب اور سنّتِ رسول ﷺ کی بالادستی ہو اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کُل کی کُل اس کے تحت ہو!''

چونکہ آج ہمیں ایک مسلمان معاشرہ میں کام کرنا ہے اور مسلمانوں ہی کو دین کا جامع تصوّر دینا ہے' لہٰذا اس کام کے لیے کسی قسم کی تشدد کی راہ اختیار نہیں کی جاسکتی۔ آپ کسی بھی کلمہ گو کے خلاف تلوار یا بندوق نہیں اٹھا سکتے۔ آج یہی راستہ کھلا ہے کہ ایک منظم جماعت کی شکل میں منکرات کے خلاف آواز اُٹھائیں اور کسی کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر منکرات کو ہدفِ تنقید بنائیں۔ اس بات پر اگر آپ پر کسی طرف سے تشدد ہوگا تو آپ کو برداشت کرنا ہوگا' لیکن حق بات سے پیچھے نہیں ہٹنا ہوگا۔ حرام کو حرام اور باطل کو باطل کہنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی حدود کی پامالی کی طرف عوام وخواص کی توجہ مبذول کرانا ہوگی۔ ہر ظلم' استحصال' ناانصافی' بے حیائی' فحاشی' سودی کاروبار' غرض ہر حرام اور غلط کام کے خلاف منظم طریقے سے آواز اٹھانا ہوگی۔

یہ طریقہ کار امت کو متحد کرنے اور اسے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے باطل کے خلاف زبردست طاقت بننے کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح بات سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور صحیح معنوں میں اقامتِ دین کے لیے جدّوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

خلاصہ گفتگو

آخر میں سیر حاصل بحث کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل دین ہے' جس میں عقیدۂ توحید' عبادات' رسومات' معاشرت' معیشت اور سیاست یعنی تمام انفرادی اور اجتماعی شعبہ جات شامل ہیں۔ گویا دینِ اسلام ایک مکمل اجتماعی نظام ہے۔

(۲) بحیثیتِ دین اسلام اپنا مکمل غلبہ چاہتا ہے' ورنہ یہ سکڑ کر صرف ایک مذہب کی حیثیت سے باقی رہ جاتا ہے۔

(۳) حضور نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپؐ نے ۲۳ سالہ محنت شاقہ کے بعد دین اسلام کو دنیا کے ایک حصہ (جزیرۃ العرب) پر غالب فرما کر ایک نمونہ (ماڈل) دنیا کے سامنے پیش کیا۔

(۴) دین کا اصل یہ ہے کہ یہ عبادتِ رب' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے ایک جامع تصوّر دیتا ہے جسے کسی صورت تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ یہ تینوں کام بطور دینی فریضہ کے کرنے ہوں گے۔

(۵) آج اُمتِ مُسلمہ قومی ریاستوں کی شکل میں تقسیم ہو چکی ہے۔ خود فراموشی‘ بے عملی‘ وَہن اور اغیار کی سازشوں نے مسلمان اُمت کو تقسیم در تقسیم کر کے فرقوں میں بانٹ دیا ہے اور اسے جوڑنے کے لیے بنیاد صرف ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ۔ اور اس کے لیے جدّوجہد کرنا اصل جہاد ہے۔

(۶) حصولِ پاکستان کی جدّوجہد کے دوران ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے وعدے کو مزید مؤکد بنایا کہ ’’اے اللہ! تو ہمیں زمین کا ایک ٹکڑا دے کر آزادی سے ہمکنار فرما تو ہم تیری بندگی پر مبنی نظامِ عدل وقسط قائم کر کے پاکستان کو اسلامی نظامِ عدل کا ماڈل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں گے‘‘۔ یہی وعدہ ایفا کرنا اب ہمارے ذمہ ہے۔

(۷) فریضہ اقامت دین کے لیے منہج اور طریقہ کار وہی اپنانا ہوگا جس کے ذریعے سے حضور نبی اکرم ﷺ نے انقلاب برپا کیا تھا۔ اس منہج کے سنگ ہائے میل ہیں: نظریۂ توحید‘ اس کی دعوت‘ ایک انقلابی جماعت کی تشکیل‘ جماعت کی تربیت اور اس کا تزکیہ‘ امر بالمعروف ونہی عن المنکر‘ اس راہ کی مشکلات پر صبر کرنا وغیرہم۔ مزید یہ کہ ایمان کی مضبوطی اور اپنے مقصد کے ساتھ پختہ وابستگی وہ قوت فراہم کرے گی جس کے بل بوتے پر منکرات کو بالفعل چیلنج کرنا ممکن ہو سکے گا۔

(۸) نتیجتاً اگر اللہ کا دین دنیا کے کسی حصے میں قائم ہو جائے تو یہ باضابطہ خلافت کی شکل اختیار کرے گا اور دنیا کے سامنے عدل وقسط‘ اخوت اور مساوات کا ایک ماڈل پھر سے سامنے آ جائے گا‘ جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں تھا۔ اسی نظام اجتماعی کے لیے دنیا ترستی ہے‘ کیونکہ انسان کا مسئلہ نہ جمہوریت نے حل کیا‘ نہ کیپٹلزم نے‘ نہ سوشلزم اور نہ ہی کمیونزم نے۔ خلافت ہی متاعِ گم گشتہ ہے جس کے لیے جدّوجہد وہی لوگ کریں گے جو خود عبادتِ رب کے لیے کمر بستہ ہو چکے ہوں۔

(۹) اس خلافت یا حکومتِ الٰہیہ کا یہ حق ہے کہ یہ پھلے پھولے اور دوسرے تمام ’’ادیان‘‘ پر غالب ہو۔ اس کے آگے اگر کوئی رکاوٹیں یا سازشیں ہوں تو حزب اللہ کو اس کے خلاف اقدام کرنا ہوگا‘ جو جہاد کی آخری منزل یعنی قرآنی اصطلاح میں قتال فی سبیل اللہ بن جاتا ہے۔ شریعت اسلامی میں اس کی چند شرائط ہیں‘ جن کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

(۱۰) یہ خلافت دنیا کے لیے ایک ماڈل ہوگی۔ اس میں عدل وقسط‘ اخوّت اور مساوات کا دور دورہ ہوگا۔ اقلیتوں کو مکمل انسانی حقوق اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ریاست ان کے مال‘ جان اور عزت وناموس کی نگہبانی کی ذمہ دار ہوگی۔ دنیا ایک دفعہ یہ نظارہ خلافت راشدہ کے دوران دیکھ چکی ہے اور یہ دور دوبارہ دنیا میں آنے والا ہے جس کے لیے قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کی متعدد احادیث میں واضح اشارات موجود ہیں۔

یہ مختصر تشریح ہے اس تصور کی جس میں اسلام کو دین کی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ اس کے مطابق ہر مسلمان نے اپنی زندگی کا رخ متعین کرنا ہے۔ یہی ایمان اور عمل صالح کا حاصل ہے۔ یہ ہماری دینی ذمہ داریاں ہیں جو ہمیں ہمارے اصل مقصد یعنی رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی کے حصول کے لیے ہم پر عائد کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب پر ان کی اصل روح کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

مسلم معاشروں میں لڑکیوں کی بغاوت؟

اسباب وعلاج

ابوکلیم مقصودالحسن فیضی ☆

پیش لفظ

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ، وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ... اَمَّا بَعْدُ:

لاہور پاکستان سے شائع ہونے والا مؤقر جریدہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' پڑھنے کو ملا' جس کا ایک عنوان اکبرالہ آبادیؒ کے ایک شعر سے ماخوذ تھا: ع

''پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ گھر سے نکل گئی!''

لکھنے والے محترم عبدالوارث ساجد صاحب ہیں۔ مضمون کی ابتدا کچھ اس طرح سے تھی:

''کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کمرے میں موجود تمام لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں' وکیل حیران تھا..... ماں شدتِ غم سے زمین پر سر پکڑے بیٹھی تھی..... اور باپ بوڑھی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہائے جا رہا تھا۔ مگر بیٹی خوش تھی' اس کے چہرے سے خوشیوں کے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور فاتحین کی طرح کٹہرے میں کھڑے مسکراتے ہوئے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی جس کے حق میں عدالت نے فیصلہ دیا تھا۔ ۳۱ مئی کی دوپہر ایڈیشنل سیشن جج محمود احمد شاکر کی عدالت میں ہونے والے اس فیصلے کا کیس نو لکھا لاہور کے چوکیدار شوکت نے درج کروایا تھا۔

☆ الغاط' سعودی عرب

شوکت چوکیدار نے بیس سال تک مسلسل راتوں کو جاگ کر چوکیداری کر کے اپنی بیٹی کو پالا پوسا' اسے اچھی غذا' اچھا لباس اور اچھی تعلیم مہیا کی۔ اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر اس نے رات دن ایک کر کے محنت کی اور بیٹی کی ہر تمنا پوری کی۔ پرائمری' میٹرک کے بعد باوجود وسائل نہ ہونے کے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج داخل کروایا۔ حسبِ معمول ایک روز اس کی بیٹی گھر سے پڑھنے کے لیے نکلی..... ایک ایک کر کے تیس دن ہو گئے' بوڑھے چوکیدار کی بیٹی واپس نہ آئی۔ ماں گھر بیٹھی آنسو بہاتی رہی' گلی محلے کی عورتیں آتیں' کچھ دلاسے دیتیں اور واپس چلی جاتیں۔ ماں شرمساری میں نظریں زمین پر گاڑے حواس باختہ دیوانوں کی طرح بیٹھی رہتی اور آنسوؤں کی زبان بولتی۔ اس ماہ کے دوران اتنا ضرور معلوم ہوا کہ جب وہ کالج گئی تھی تو کالج آتے جاتے محلے کے ایک آوارہ لڑکے جاوید سے ملتی تھی اور کبھی کبھار شام کو سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر اسی کے ساتھ کہیں جاتی تھی۔ شوکت چوکیدار نے بیٹی کے اغوا کا کیس درج کروا دیا۔ پولیس نے جاوید کو برآمد کیا۔ کیس عدالت میں پہنچا تو جج نے والدین اور لڑکی سمیت جاوید کو عدالت میں حاضر ہونے کا نوٹس جاری کر دیا۔

مقررہ تاریخ ۳۱ مئی کی دوپہر عدالت کے احاطہ میں لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ وکیل حاضر تھے اور جج اپنی کرسی پر براجمان تھا۔ کمرۂ عدالت میں لڑکی داخل ہوئی تو اُس نے اپنے باپ کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ بوڑھی والدہ ناتواں جسم لیے کمزور ٹانگوں سے چلتی ہوئی اس کے پاس گئی اور پیار بھرے شیریں لہجے میں بولی: ''بیٹی تم پریشان مت ہونا! ہم آ گئے ہیں.....'' رحم دل ماں نے ابھی اپنی بات بھی مکمل نہ کی تھی کہ بدنصیب بیٹی کسی زخمی شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی بولی: ''یہ سارا ڈرامہ ہے' مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا' میں اپنی مرضی سے گئی ہوں اور میں نے اپنی مرضی کے ساتھ شادی کی ہے''۔ شوکت چوکیدار کے وکیل شیخ شاہد نے لڑکی کو سمجھاتے ہوئے کہا: ''بیٹی تمہارے والدین بوڑھے ہیں' وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے''۔ بیٹی نے جواب دیا: ''مجھے والدین کی پروا نہیں' میں جاوید کے ساتھ خوش ہوں اور اس کے ساتھ جاؤں گی''۔ ماں نے بیٹی کا جواب سنا تو زمین پر گر گئی' بوڑھا باپ دیوانہ وار آنسو بہانے لگا۔ اب جرح کے لیے وکیلوں کے پاس کچھ نہ تھا اور نہ ہی سننے کے لیے جج کے پاس۔ فیصلہ ہو گیا' عدالت برخواست ہوئی' لوگ گھروں کو چلے گئے۔ کچھ رحم دل انسانوں نے بوڑھے والدین کو دلاسہ دیا۔ سہارا دے کر عدالت

سے باہر نکالا۔ لڑکی اپنے محبوب کے ساتھ چلی گئی اور بوڑھے والدین نے آنسوؤں کی برسات میں کہا: ’’بیٹی! اگر تم خوش ہو تو خوش رہو‘ ہم تمہارے لیے مر گئے اور تم ہمارے لیے‘‘۔ اور خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے۔

یہ ایک دن یا ایک جگہ کا واقعہ نہیں‘ ایسے واقعات پاکستان کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں بکثرت ہونے لگے ہیں۔ آنے والا ہر دن اور اخبارات میں ایسی خبریں ہر روز شائع ہوتی ہیں۔ یہ کیوں ہوتا ہے......؟ کیسے اور کس طرح ہو جاتا ہے......؟ یہ سوچنے کے لیے نہ جانے ہم کیوں تیار نہیں ہوتے؟ یہ بات ایک گھر...... ایک گاؤں...... یا پھر ایک شہر کی ہوتی تو بھی مسئلہ سنگین نہ ہوتا‘ لیکن یہ زہر تو پورے معاشرے کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس سے بڑی سنگ دلی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک جوان‘ سمجھدار اور تعلیم یافتہ لڑکی کے بوڑھے والدین آنکھوں میں اشک لیے بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں‘ لیکن محبت کی ماری بیٹی اپنے محبوب کے ساتھ جانے پر مُصر ہے۔

اس قسم کی بیٹیوں کی مثالیں ہمارے معاشرے اور نئی تہذیب سے آراستہ سوسائٹی میں موجود ہیں۔ یہ واقعات اس دلدل کی عکاسی کر رہے ہیں جس میں ہم بری طرح دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ آئے روز رونما ہونے والے یہ واقعات خبر کی صورت میں اخباروں کی زینت بنے تاریخ کا حصہ بنتے چلے جا رہے ہیں اور ہماری بے حسی پر منہ چڑا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں......؟ بوڑھے والدین کی اولاد کی جوانی میں یہ رسوائی کیونکر ہوتی ہے......؟ اور رحمت کہلانے والی بیٹی ایک روز زحمت کیوں بن جاتی ہے......؟ اگر ان سب سوالات کو ہم حل طلب نظروں سے دیکھیں تو اس میں سب سے بڑے مجرم خود والدین ہی نظر آتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی صورتِ حال...... میڈیا کی بے باکی...... اور تعلیمی اداروں کا مخلوط ماحول...... تو قصوروار ہیں ہی‘ لیکن اولاد کے بگاڑ میں ان سب سے بڑا کردار والدین کا ہوتا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد اپنے معاشرے کی زبوں حالی‘ اس کے اسباب اور علاج پر اپنے قلم کو جاری رکھا ہے‘ غیر قوم کی مشابہت‘ قوم کی بے راہ روی اور اپنوں کی بے غیرتی کا رونا رویا ہے اور آخر میں اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر پر اپنے مضمون کو ختم کیا ہے کہ ؎

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ گھر سے نکل گئی!

میں نے یہ مضمون پڑھا اور اس سے قبل بھی اس قسم کے واقعات پڑھنے اور سننے میں آتے رہے ہیں‘ جن میں سے بعض واقعات پر سے انسان سرسری طور پر گزر جاتا ہے‘ البتہ بعض واقعات اپنا اثر دیر تک کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کے ایک شریف مسلم گھرانے کا واقعہ ہے کہ لڑکی والدین کا گھر چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ نکل جاتی ہے‘ والدین پر اس کا اثر بہت ہی گہرا پڑتا ہے‘ لاکھ جائز و ناجائز تدابیر اختیار کرنے کے باوجود بھی اپنے والدین کے گھر واپس نہیں آتی‘ بلکہ صورتِ حال یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ والدین اس محلے‘ محلے کی مسجد اور وہاں سے اپنے کاروبار کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً صرف اپنے محلے اور شہر ہی میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور حضرتِ والد کو قیامت خیز شرمندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ حضرتِ والد کے ذہن پر اتنا گہرا اثر چھوڑتا ہے کہ سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جب لڑکی ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگتی ہے تو وہ اسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

معاشرہ کے ایک فرد‘ ایک داعی اور سب سے پہلے ایک انسان ہونے کے ناطے اس نئے اور پرانے واقعے نے مجھ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اس بغاوت‘ بے راہ روی اور جنسی آوارگی کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کا علاج کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہماری پاکیزہ شریعت نے اس کا حل کیا رکھا ہے؟ اور وہ کیا غلطی ہے جس کے سبب والدین کو یہ سیاہ دن دیکھنے پڑتے ہیں؟ چنانچہ ۲/جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۲۶ھ بروز جمعرات سعودی عرب‘ الغاط میں میں نے اپنے ہفتہ واری درس کا عنوان یہ رکھا: ’’لڑکیوں کی بغاوت؟ اسباب و علاج!‘‘

قرآن و حدیث کی روشنی میں اصل خرابی اور بنیادی غلطی پر تقریباً ایک گھنٹے کی تقریر کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ والدین سے لڑکیوں کی بغاوت کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ان کے والدین خصوصاً والدِ محترم نے لڑکیوں کی نسبت اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا‘ مثلاً وقت پر شادی نہ کی‘ پردے کا حکم نہ دیا‘ لڑکے لڑکیوں کے میل جول پر پابندی نہ لگائی اور اپنے گھر کو فلموں اور ڈراموں کی نمائش سے دور نہ رکھا‘ وغیرہ وغیرہ۔

اس دوران اس قسم کے متعدد واقعات پڑھنے اور سننے میں آتے رہے اور کئی حادثات تو ہماری رہائش والے شہر و دیہات کے قریب بھی پیش آئے۔ مثلاً ایک ''ع'' نامی تین بچوں والی عورت اپنے شوہر کے ایک دوست کے ساتھ نکل گئی' جو اُن کا کرایہ دار بھی تھا۔ اسی طرح ایک سولہ سالہ لڑکی نے اپنے گھر آنے جانے والے ایک نوجوان کے ساتھ' والدین کو روتا چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر لی۔ اسی طرح اٹلی کے باشندہ ایک ایشیائی باپ نے اپنی بیس سالہ بیٹی کو اُس کی ماں کی عدم موجودگی میں قتل کر کے اپنے گھر کے باغیچے میں دفن کر دیا' جس کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک اٹالین دوست کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی' جبکہ اہل خانہ کی خواہش تھی کہ اپنے ہی خاندان کے کسی فرد کے ساتھ اس کی شادی کریں۔ [جریدہ الریاض ۲۱/۸/۱۴۲۷ھ]

اس قسم کے متعدد واقعات نے ذہن کو ابھارا کہ اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہیے۔ دوسری طرف عزیزم محمد مقصود علاء الدین سین سلمہ اللہ تعالیٰ بار بار یہ مطالبہ دہراتے رہے کہ اس تقریر کو تحریری شکل دی جائے' کیونکہ حالات کے لحاظ سے یہ بڑا اہم موضوع ہے' جبکہ اصلاح پسند حضرات نادر ہی اس قسم کے موضوعات کو دلیل و مثال کے ساتھ عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔

یہی اصل وجہ اس کتابچے کی تالیف کی' جس کے ذریعے ہر غیور باپ' بھائی اور ذمہ دار کو یہ دعوت دینا مقصود ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ شرعی حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے والدین بلکہ پورے خاندان کو جن شرمندگیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے بچنے کی واحد راہ یہی ہے کہ ان حدود کی حفاظت کی جائے اور اس حکمِ الٰہی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا جائے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَیْهَا مَلٰٓىِٕكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝۶﴾ (التحریم)

''اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں' جس پر سخت دل مضبوط فرشتے مقرر ہیں' جنہیں جو حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے' بلکہ جو حکم دیا جائے بجا لاتے ہیں۔''

نیز اس حدیثِ نبوی کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ

إِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ))(۱)

''جس کسی بندے کو اللہ تعالیٰ رعایا کی ذمہ داری دیتا ہے اور اس کی موت اس حالت میں ہوتی ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ دھوکہ کرنے والا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتا ہے۔''

چنانچہ ہر باپ اپنے زیرِ کفالت اہل خانہ کا ذمہ دار ہے' اس پر واجب ہے کہ ان کے ساتھ خیر خواہی کرے' انہیں حرام و حلال میں واضح فرق بتلائے' دین و دنیا کے لیے مفید چیزیں بتلائے' نقصان دہ چیزوں سے دور رکھے اور متنبہ کرے۔ ورنہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ دھوکہ کرنے والا متصور ہوگا' جس کا انجام حدیثِ نبوی ﷺ میں بہت ہی واضح الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ ''جنت اس پر حرام ہے۔''

ایک اور حدیث میں ارشادِ نبی ﷺ ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ سَائِلٌ كُلَّ رَاعٍ عَمَّا اسْتَرْعَاهُ أَحَفِظَ ذٰلِكَ أَمْ ضَيَّعَ؟ حَتّٰى يَسْأَلَ الرَّجُلَ عَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ))(۲)

''اللہ تعالیٰ ہر ذمہ دار سے اُس کی ذمہ داری میں دی گئی چیزوں سے متعلق سوال کرے گا کہ آیا اُس نے اس کی حفاظت کی یا اسے ضائع کر دیا' حتیٰ کہ آدمی سے اس کے اہل خانہ سے متعلق بھی سوال کرے گا۔''

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ کھلے لفظوں میں ہر باپ' بھائی اور گھر کے ذمہ دار کو یہ دعوت دے رہی ہیں کہ وہ اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز داخل نہ کریں جو دین و دنیا میں اہل خانہ کے لیے خسارے کا سبب بن رہی ہوں۔ وہ اپنی بہن' بیٹی اور بیوی کو کسی ایسی جگہ نہ جانے دیں جہاں جانا اُن کے لیے جائز نہ ہو۔ اپنی بہن' بیٹی اور بیوی کو ہر ایسے شخص کے سامنے آنے سے روکیں جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ اسی طرح اپنی بہن بیٹی کو ہر ایسی جگہ پڑھنے' کام کرنے اور آنے جانے سے روکیں جہاں مَرد و زن کا میل جول ہو اور غیر شرعی طرزِ رہائش اپنایا گیا ہو' اِلٰی آخرہ...... ورنہ بعد میں جہاں اس دنیا میں کفِ افسوس ملنا پڑے گا وہیں قیامت کے دن اللہ احکم الحاکمین کے سامنے اپنے اس عمل کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔

قارئینِ کرام! واضح رہے کہ اس موضوع کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور تقریر کا جو اصل موضوع تھا اسے قدرے عام شکل دے دی گئی ہے۔ آیاتِ کریمہ و احادیثِ مبارکہ کی شرح

میں علماء کرام کے اقوال نقل کر کے اسے طول نہیں دیا ہے‘ کیونکہ میرا مقصد کوئی کتاب اور علمی مقالہ تحریر کرنا نہ تھا‘ بلکہ عام اور سہل انداز سے بڑے ہی اختصار کے ساتھ دل کی بات عام لوگوں خصوصاً خاندان کے ذمہ دار حضرات کے سامنے پیش کرنا تھی۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تو فبہا‘ ورنہ اہلِ علم وقلم حضرات سے گزارش ہے کہ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے تفصیل سے اُمت کے سامنے رکھیں‘ تاکہ جہاں ایک طرف امت کی اصلاح کی کوشش میں حصہ دار بنیں وہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی ذمہ داری سے بَری سمجھے جائیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے محسن ابوعبدالرحمٰن شیخ شبیر احمد نورانی کو جنھوں نے ان اوراق کو غور سے پڑھا اور کانٹ چھانٹ اور ردّ وبدل کا مشورہ دیا۔ کہیں کہیں توضیحی نوٹ لگائے‘ جسے میں نے بعینہٖ حاشیہ میں رکھ دیا ہے‘ جَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء!

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ وَصَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ۔

لڑکیوں کی بغاوت؟ اَسباب وعلاج

ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت نظامِ عالم ہر میدان میں سخت انتشار کا شکار ہے‘ ہر طرف ایک خلفشار بپا ہے۔ سیاسی طور پر دیکھا جائے تو دنیا کے ہر گوشے میں عجیب سا اضطراب پایا جاتا ہے۔ ہر صاحبِ بصیرت یہ دیکھ رہا ہے کہ دنیا کے نظامِ سیاست کا مستقبل سخت تاریک ہے۔ نظامِ اقتصاد‘ نظامِ سیاست سے کچھ بہتر نہیں‘ کساد بازاری اور مہنگائی اپنے عروج پر ہے‘ گھر کا ہر فرد کما رہا ہے پھر بھی گھریلو ضروریات پوری نہیں ہو رہیں۔ بڑی بڑی عالمی تجارتی کمپنیاں ٹھپ ہو رہی ہیں۔ اجتماعی اور معاشرتی نظام بھی نظامِ سیاست واقتصاد سے کچھ بہتر نہیں ہے‘ لوگوں سے اجتماعیت اور اخلاص ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشرہ میں باہمی تعلقات صرف ذاتی مصلحت کی بنیاد پر استوار ہیں‘ مصلحت بینی لوگوں کا شعار بنتی جا رہی ہے۔ ہمدردی‘ صلہ رحمی اور للہ فی اللہ دوستی برائے نام رہ گئی ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے نام تک نہیں جانتے۔ مسلم وغیر مسلم معاشرہ میں جنسی بے راہ روی صرف تشویشناک ہی نہیں بلکہ خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے۔ زنا بالجبر اور بہو بیٹی کے ساتھ زنا کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ پالنے پوسنے والے والدین سے لڑکوں اور لڑکیوں کی بغاوت عام دستور بن چکا ہے۔ سعودی عرب جیسے ملک

میں ایک اخباری رپورٹ کے مطابق ایسے حادثات خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ گھر سے بھاگنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ۳۲۸۵ تک پہنچ گئی ہے‘ جن میں سے ۸۵۰ لڑکیاں ہیں (۳)۔ آج سے کئی سال قبل امریکہ میں ایک رپورٹ کے مطابق روزانہ ۱۹۰۰ لڑکیوں کی عصمت دری ہوتی ہے (۴)۔ یعنی ہر چالیس اور پینتالیس سیکنڈ میں ایک زنا بالجبر۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان میں ۲۰ فیصد لڑکیاں خود اپنے والد کی ہوس کا شکار بنتی ہیں اور ۲۶ فیصد دیگر قریبی رشتہ داروں کی ہوس کا‘ اور ۵۱ فیصد گھر میں آمد ورفت رکھنے والے افراد کا‘ اور باقی صرف ۴ فیصد رہ جاتا ہے جس کے مرتکب نامعلوم لوگ ہیں۔

عالمی پیمانے پر جنسی بے راہ روی میں اضافہ‘ اغوا اور زنا بالجبر کے واقعات اس قدر کثرت سے ہو رہے ہیں کہ حکومتوں کے لیے یہ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ بعض حکومتوں نے اس کے تدارک کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے عورتوں کے لیے اپنے دفاع کی خاطر لڑکیوں کو تربیت دینا شروع کی ہے۔ بمبئی یونیورسٹی نے خاص قسم کے لباس پر پابندی لگا دی ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ اہلِ قلم اور دانشور حضرات اصلاحِ احوال کی خاطر اپنی اپنی رائے پیش کر رہے ہیں‘ کوئی ذرائع ابلاغ (یا میڈیا) کو ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے‘ کوئی والدین کی سختی سبب بتا رہا ہے‘ کسی نے گندی ذہنیت اور بہیمیت کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ سچ اور مسلم ہیں‘ لیکن حق یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں ایک قانونی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان برائیوں کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔

قارئین کرام! صحیح بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی والدین سے بغاوت اور جنسی بے راہ روی کی اصل وجہ دینِ حق سے دوری‘ غیر شرعی نظامِ تعلیم‘ مختلف میدانوں میں مَرد وزن کا اختلاط‘ عورتوں کی آزادی اور بچوں کی صحیح اسلامی تعلیم سے بیگانگی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ان اسباب کی طرف نہ تو حکومتیں توجہ دے رہی ہیں اور نہ ہی اہلِ قلم حضرات (۵) ان اسباب کو سمجھ کر کوئی حل پیش کر رہے ہیں۔

برادرانِ اسلام! آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ اسلام نے معاشرہ کو اس بے راہ روی اور بغاوت سے بچانے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟ جنھیں قبول نہ کر کے مسلم معاشرے خصوصاً اور عالمی معاشرہ عموماً اس موڑ پر پہنچ چکا ہے کہ اسے بربادی سے بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔

قارئین کرام! جب ہم قرآن مجید اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا

ہے کہ اسلام نے اس قسم کی برائی سے بچنے کے لیے کچھ تعمیری (مثبت) اقدام پیش کیے ہیں اور کچھ حفاظتی (منفی) اقدام۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر غیرت مند باپ اور ذمہ دار کو چاہیے کہ اپنے معاشرے کو برائیوں سے پاک وصاف رکھنے کے لیے اور اپنے بچوں کو بغاوت سے بچانے کے لیے کچھ بنیادی احکام پر عمل کا اہتمام کریں اور ان شرعی پابندیوں کا لحاظ رکھیں' اور کچھ ممنوعہ کاموں سے پرہیز کریں اور ان پابندیوں کو چھوڑ کر شُتر بے مہار نہ بن جائیں۔

اگر ایک مسلم معاشرہ کے سماجی کارکن اور دانشور حضرات فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ ان کا معاشرہ پرامن اور پاک وصاف رہے..... اگر غیرت مند ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی لڑکیاں اور لڑکے ان سے بغاوت نہ کریں اور انہیں وہ دن نہ دیکھنا پڑے کہ معاشرے میں ان کے لیے منہ چھپانے کی جگہ باقی نہ رہے..... تو انہیں ان تعلیماتِ الٰہیہ پر لازماً عمل کرنا ہوگا' ورنہ جب چڑیاں کھیت چگ جائیں تو پچھتانے سے کچھ نہیں ملتا۔ نہ منہ چھپانے سے قرار آتا ہے اور نہ خودکشی کرنے سے روح کو سکون ملتا ہے..... لہٰذا ابھی وقت ہے' فائدہ اٹھالیں۔

تعمیری اقدامات

(۱) تقویٰ اور خوفِ الٰہی پیدا کرنا

اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ کوئی بھی کام کرتے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے ساتھ مانے کہ میرے ہر کام پر وہ میرا محاسبہ کرے گا۔ یہ یقین انسان کو کسی کام کے کرنے یا اس سے رکنے کے لیے انتہائی اہم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۲۹﴾ (الانفال)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا اور تم کو بخش دے گا' اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

اس آیت میں تقویٰ کے تین فوائد بیان ہوئے ہیں' جن میں سے سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فرقان عطا فرمائے گا' یعنی تمہارے اندر ایسا ملکہ پیدا کردے گا کہ تم اس کے

ذریعے حق و باطل' نفع ونقصان' ہدایت وضلالت اور طہارت وغلاظت میں فرق کرلوگے' نیز شیطان کے راستے اور رحمن کے راستے میں تمیز کرلوگے' جس کی وجہ سے تم شیطان کے شر سے محفوظ رہوگے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۲۰۱﴾ (الاعراف)

''حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے)۔''

یعنی جب بھی شیطان انہیں کسی غلط کام پر ابھارتا ہے' کسی اجنبی عورت کی طرف غلط نظر اٹھانے کی دعوت دیتا ہے' زنا اور اس کے اسباب کی طرف رغبت دلاتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس کے شر سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام جوان عمر ہیں' غیر شادی شدہ ہیں اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں (جو اپنے مالک ہی کے تابع فرمان ہوتا ہے) اور دوسری طرف عزیزِ مصر کی جوان عمر بیوی اپنے آپ کو خود پیش کر رہی ہے' تنہائی ہے اور ان کی طرف جنسی رغبت سے بڑھ رہی ہے..... ایسے پُرفتن موقع پر آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے انہیں اس کی طرف راغب ہونے سے محفوظ رکھا؟ کیا فضلِ الٰہی کے ساتھ خوفِ الٰہی اور تقویٰ کے علاوہ کوئی اور چیز بھی جو حضرت یوسف علیہ السلام اور معصیت کے درمیان حائل ہو رہی تھی؟ ہرگز نہیں! بلکہ وہ صرف تقویٰ ہی تھا جس نے انہیں اس عظیم آزمائش میں ثابت قدم رکھا۔

یہی وہ تقویٰ ہے جسے اسلام اپنے ماننے والوں میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل ایک عورت زنا کا پیشہ کیا کرتی تھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ بھی اسلام میں داخل ہوگئی۔ زمانۂ جاہلیت میں کسی مرد سے اس کے تعلقات تھے' لیکن بفضلِ الٰہی وہ بھی مشرف باسلام ہوگیا۔ دونوں کے اسلام لانے کے بعد ایک بار جب تنہائی میں مرد نے اس عورت کی طرف اپنا ہاتھ بڑھانا چاہا تو اس مبارک بی بی نے یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو بچالیا:

فَإِنَّ اللهَ قَدْ أَذْهَبَ الشِّرْكَ وَ جَاءَ بِالإِسْلَامِ

''ٹھہر جاؤ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اب شرک کا خاتمہ کردیا اور اسلام کا دور آ گیا (اور اب

اس قسم کے گندے کاموں کی گنجائش نہیں رہی)''۔(۶)

سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور اس کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو وہ عورت اور وہ مرد جن کی سابقہ زندگی برائی میں گزر رہی تھی اس طرف دوبارہ کیوں نہ پلٹتے؟

تقویٰ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سابقہ گناہوں سے خلاصی مل گئی۔ اور تیسرا فائدہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب مغفرت کا پروانہ مل گیا تو گویا یہ کہہ دیا گیا کہ سابقہ غلطیوں سے اب تم پاک صاف ہو' آئندہ احتیاط سے کام لینا۔ یہی تقویٰ کا خلاصہ ہے۔

(۲) فطری غیرت کو بیدار کرنا

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کے لیے خیر و بھلائی کا جذبہ اپنے دل میں رکھے اور ہر قسم کے شر اور بُرائی سے جس طرح خود دور رہنا پسند کرتا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی بچائے۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ [مِنَ الْخَیْرِ]))(۷)

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی وہی چیز پسند نہ کرے جو خود اپنے لیے پسند کر رہا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((وَاَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ تَکُنْ مُؤْمِنًا))(۸)

''جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی بھلائی لوگوں کے لیے بھی پسند کرو تو سچے مسلمان بن جاؤ گے۔''

سچ کہا ہے حالیؔ مرحوم نے ؎

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں!

مقصود یہ ہے کہ جب انسان اپنے بھائی کے نفع و نقصان کو اپنا نفع و نقصان سمجھے گا' اپنے بھائی

کی بہن بیٹی کو اپنی بہن بیٹی تصور کرے گا تو جب بھی اُس کے دل میں کوئی ناپاک جذبہ اٹھے گا وہ فوراً اسے دبا دے گا اور کوئی عملی اقدام کرنے سے قبل بار بار سوچنے پر مجبور ہوگا کہ یہ ایسی نازیبا حرکت ہے کہ جسے کوئی بھی فردِ بشر پسند نہیں کرتا' لہٰذا میں ایسا کیونکر کروں؟ درجِ ذیل حدیثِ نبوی ﷺ میں انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا گیا ہے اور اس کی فطری غیرت کو جگایا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور صحابیٔ رسول ﷺ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے زنا کی اجازت دے دیجیے۔ یہ سن کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے جھڑکنے لگے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو منع فرمایا اور نوجوان سے فرمایا کہ میرے قریب آجاؤ' چنانچہ وہ آپ ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گیا' آپ ﷺ نے اُس سے پوچھا:

((اَتُحِبُّہٗ لِاُمِّکَ؟)) ''کیا تم یہ کام اپنی ماں کے لیے پسند کرتے ہو؟''

اُس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ پر قربان جاؤں' اللہ کی قسم' مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسی طرح لوگ بھی اپنی ماؤں کے لیے پسند نہ کریں گے''۔ آپ ﷺ نے پھر سوال فرمایا:

((اَفَتُحِبُّہٗ لِابْنَتِکَ؟)) ''کیا پھر تم اسے اپنی بیٹی کے لیے پسند کرتے ہو؟''

اُس نے جھٹ سے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آپ پر قربان جاؤں' اللہ کی قسم' مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہ ہی لوگ اس کو اپنی بیٹیوں کے لیے پسند کریں گے''۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا:

((اَفَتُحِبُّہٗ لِاُخْتِکَ؟)) ''تو کیا پھر اپنی بہن کے لیے یہ کام پسند کرتے ہو؟''

اُس نے جواب دیا: میں آپ پر قربان جاؤں' اللہ کی قسم! میں اسے پسند نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لیے یہ پسند نہیں کریں گے''۔ آپ ﷺ نے مزید سوال فرمایا:

((اَفَتُحِبُّہٗ لِعَمَّتِکَ؟)) ''تو کیا تم اپنی پھوپھی کے لیے اس کو پسند کرتے ہو؟''

اُس نے جواب دیا: مجھے اللہ آپ پر قربان کردے' اُس کی قسم! میں اسے پسند نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اور نہ ہی لوگ اسے اپنی پھوپھیوں کے لیے پسند کریں گے''۔

آپ ﷺ نے مزید اس سے سوال کیا:

((اَفَتُحِبُّہٗ لِخَالَتِکَ؟)) ''تو کیا تم اس کام کو اپنی خالہ کے لیے پسند کرتے ہو؟''

اُس نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کردے' اُس کی قسم! میں اسے اپنی خالہ کے لیے بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور لوگ بھی اس کام کو اپنی خالاؤں کے لیے پسند نہ کریں گے''۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اس پر رکھا اور فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَہٗ وَطَھِّرْ قَلْبَہٗ وَحَصِّنْ فَرْجَہٗ))(۹)

''اے اللہ تعالیٰ! اس کا گناہ معاف کردے' اس کا دل پاک کردے اور اس کی شرمگاہ محفوظ فرمادے۔''

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان کسی گناہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔

حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب تم اس غلیظ کام کو اپنی ماں' بہن اور بیٹی وغیرہ کے لیے پسند نہیں کرتے تو دوسروں کی ماں' بہن' بیٹی کے لیے کیونکر پسند کرتے ہو؟ بلکہ تمہیں چاہیے کہ ہر مسلمان حتیٰ کہ ہر انسان کی بہن بیٹی کی عزت کا پاس ولحاظ رکھو۔ یہ حدیث امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی روایت کی ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ ذکر کیا ہے:

((فَاکْرَہْ مَا کَرِہَ اللّٰہُ وَأَحِبَّ لِأَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ))(۱۰)

''چنانچہ جس چیز کو اللہ ناپسند کرتا ہے اسے تم بھی ناپسند کرو اور اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔''

قارئین کرام! یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور حکیم الانبیاء حضرت محمد مصطفی ﷺ کی یہ عمدہ تعلیم ہے جسے تمام لوگوں میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ کاش کہ ہمارے معاشرہ کے وہ لوگ جن کا کام ہی لوگوں کی عزتوں پر ڈاکہ ڈالنا ہے اس فرمانِ نبوی ﷺ پر غور کر لیتے اور لوگوں کی عزت وناموس پر حملہ آور ہونے کی بجائے اس کی حفاظت کرتے' کیونکہ نتیجتاً یہ خود ان کی اپنی عزت وناموس کی حفاظت کا راستہ ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) صحیح البخاری: ۱۷۵۱' الاحکام۔ صحیح مسلم: ۱۴۲' الایمان بروایت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ۔

(۲) سنن النسائی الکبریٰ: ۳۷۷/۵۔ صحیح ابن حبان: ۴۴۷۶' ۴۶۵/۶' بروایت انس رضی اللہ عنہ دیکھئے: الصحیحۃ: ۱۲۲۶۔

(۳) روزنامہ الریاض: ۱۴۲۷/۴/۲۶ھ۔ (واضح رہے کہ یہ اعداد وشمار ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء کے ہیں۔ آج ۱۵ سال بعد ان میں مزید اضافہ ہو چکا ہے۔)

(۴) یہ اعداد وشمار تو ان زنا بالجبر کے بارے میں ہیں جو رپورٹ ہوتے ہیں' اور جو رپورٹ ہی نہیں ہوتے یا جو زنا بالرضا ہوتے ہیں اس کا اندازہ خود کر لیں کہ یہ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوں گے۔ (نورانی)

(۵) اس سے مراد اخبارات وجرائد میں لکھنے والے قلم کار صحافی ہیں' ورنہ اہلِ علم نے اس موضوع پر وہی کچھ لکھا ہے جسے میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

(۶) مسند احمد ۸۷/۴۔ صحیح ابن حبان: ۲۴۵۵۔ الموارد' دیکھئے: صحیح الموارد۔

(۷) صحیح البخاری: ۱۳' الایمان۔ صحیح مسلم: ۴۵' الایمان۔ سنن النسائی: ۵۰۲۰' الایمان۔ مسند احمد: ۲۰۶/۳' ۲۰۶۱۳' بروایت انس رضی اللہ عنہ۔ لفظ ''الخیر'' کا اضافہ سنن نسائی اور مسند احمد کا ہے۔

(۸) مسند احمد: ۳۰۱/۲۔ سنن الترمذی: ۲۳۰۵' الزھد۔ الادب المفرد: ۲۵۲' بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ' دیکھئے: الصحیحۃ: ۷۲۔

(۹) مسند احمد: ۲۵۶/۵ و ۲۵۷۔ معجم الطبرانی الکبیر: ۷۶۷۹' ۱۹۰/۸۔ دیکھئے: الصحیحۃ: ۲۷۰۔

(۱۰) الفتح الربانی: ۷۱/۱۶۔

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

شرعی سزائیں اور سیکولر دانشوروں کا موقف

محمد ندیم اعوان ☆

بلا شبہ جاوید چوہدری صاحب کا شمار ملک کے سینئر تجزیہ کاروں اور کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ یقیناً اُن کے فین' فالورز اور قارئین کی تعداد لاکھوں میں ہے' جس کی وجہ اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ جاوید چوہدری صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ دیگر حضرات کی طرح صرف ایک کالم نگار یا تجزیہ کار نہیں' بلکہ وہ بیک وقت قطب شمالی اور قطب جنوبی سفر کرنے والا ابن بطوطہ کا ہمراہی' معروف موٹیویشنل سپیکر اور ٹرینر' جو شاید ''اینتھونی روبن'' کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے' ایک کامیاب تجزیہ کار جس کے آگے تمام ملکی و بین الاقوامی مسائل ہیچ ہیں' ایک بے مثال سفارت کار جو ایٹم بم برسانے کے بدلے چیری کے پھول اور پتے بھیجنے کا آرزومند ہے' ایک دور اندیش اور مخلص سیاست دان جس کے آگے ذوالفقار علی بھٹو' نواز شریف اور عمران خان کی کوئی اوقات ہی نہیں' جو مہا تیر وارد گان کو بھی شکست دے اور قائداعظم محمد علی جناح پر بھی سبقت لے جائے۔ بین الاقوامی تعلقات کے اسرار و رموز سے واقف وزیر خارجہ' حالات کی نزاکت کو سمجھنے والا وزیر داخلہ اور جب یہ خمار سر چڑھ کر بولے تو پھر وہ سیاسی حالات کے بارے میں پیشین گوئی کرنے والے ایک عامل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار شیخ' مفسر' محدث' مؤرخ' فلسفی' مفکر' علامہ اور حکیم الامت کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ آپ اگر مسلسل ایک مہینے تک اخبار میں چھپنے والے ان کے مضامین کا مطالعہ کریں تو آپ بھی جاوید چوہدری صاحب کے یہ تمام روپ دیکھ کر داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے' کیونکہ وہ جو بھی روپ اختیار کرتے ہیں کمال کر دیتے ہیں۔

مجھے تین ماہ قبل دسمبر کی بارہ تاریخ کو چند لمحوں کے لیے ان کی زیارت اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا اور پچھلے تین سالوں سے پابندی کے ساتھ ان کے مضامین پڑھنے کی سعادت بھی حاصل رہی ہے اور بلا مبالغہ ایک بھی کالم ایسا نہیں جو میں نہ پڑھ چکا ہوں۔ مجھے اس بات کا

☆ nts143043@gmail.com

اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ میں نے چوہدری صاحب سے بالواسطہ بہت کچھ سیکھا اور جانا ہے' لیکن جس طرح مجھ سمیت چوہدری صاحب کے مطابق وہ اپنی دنیاداری پر فخر کرتے اور مولانا طارق جمیل صاحب کی اصلاحی باتوں کو سیریس نہیں لیتے اور اُن سے متاثر نہیں ہوتے' بالکل اسی طرح مجھ سمیت چوہدری صاحب کے بعض قارئین بھی اُن کے بعض مضامین کو سیریس لیتے ہیں نہ متاثر ہوتے ہیں' بلکہ اُنہیں انجوائے کرتے ہیں' خصوصاً جب وہ مذہب کے بارے میں اپنے تأثرات اور احکامِ دینی کے بارے میں اپنے اجتہاد کا اظہار کرتے ہیں۔

یوں تو چوہدری صاحب مثبت سوچ کے علمبردار ہیں' جو پاکستان کو جنگل اور شہریوں کو وحشی قرار دے کر پر تشدد اور غیر متوازن رویوں کا رونا روتے ہیں' جس میں ہم اُن سے کُلّی طور پر اتفاق کرتے ہیں' لیکن دین و مذہب' مدارس و مساجد اور مسلمانوں کے بارے میں اُن کا رویہ بالعکس ہے۔ چنانچہ اسلامی احکام کے بارے میں اپنا ''اجتہاد'' پیش کر کے بائیس کروڑ عوام کو دین و مذہب کے بارے میں بدظن کرنے اور اُن کی روحانی وابستگی کو متزلزل کرنے کے ساتھ ساتھ جذبات کو مجروح کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

۷ فروری کو بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کر کے قتل کرنے والوں کو سرِعام پھانسی کا ایشو جب قومی اسمبلی میں پہنچا اور زیر بحث آیا تو اکثریت نے اس قرارداد کی حمایت کی' سوائے تین افراد کے' جن میں سے ایک انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹنے والی شیریں مزاری' ایک ہمارے وزیر سائنس و ٹیکنالوجی فواد چوہدری صاحب اور تیسرے جناب فروغ نسیم صاحب ہیں۔ اس کے بعد چوہدری صاحب نے قرارداد کی مخالفت کرنے والوں کی جرأت کو سلام پیش کرتے ہوئے اپنے تیرہ فروری کے کالم میں مذکورہ بالا ایشو کے بارے میں اپنے اجتہاد سے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی اور قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا' لیکن درحقیقت یہ فقط چوہدری صاحب کا فکری مغالطہ ہے اور کچھ نہیں' جس کو سمجھنے کے لیے آپ کو کم از کم شرعی سزاؤں کے بارے میں بنیادی علم کا ہونا ضروری ہے۔

شریعت میں امن عامہ کو برقرار رکھنے اور انسدادِ جرائم کے لیے تین قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں' حدود' قصاص اور تعزیرات۔ حدود سے مراد وہ سزائیں ہیں جن کی کمیت اور کیفیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ ہے' جس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی' ترمیم و تنسیخ کا نہ کسی حاکم کو اختیار ہے نہ قاضی کو اور نہ ہی زمان و مکان اس پر اثر انداز ہوتے ہیں' بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے عین

مطابق نافذ کیا جائے گا۔ جیسے چوری کی سزا' تہمت کی سزا' زنا کی سزا' شراب خوری کی سزا' ڈاکہ زنی کی سزا اور بعض علماء نے اس میں ارتداد کی سزا کو بھی شمار کیا ہے۔ یہ وہ سزائیں ہیں جن کے ضمن میں صدر یا وزیراعظم کے خصوصی اختیارات' پارلیمنٹ کی اکثریت' انسانی حقوق کے علمبرداروں کی بدمعاشیوں یا پھر کسی دانشور کی خامہ فرسائیوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ وہ حدود ہیں جن کی کسی بھی طرح مخالفت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ''ظالم'' قرار دیتا ہے۔

دوسری قسم کی سزاؤں کو قصاص کہا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ﴾ (آیت ۱۷۸) ''اے ایمان والو! تم پر قصاص کو لازم قرار دیا گیا ہے' آزاد کے بدلے آزاد' غلام کے بدلے غلام' عورت کے بدلے عورت... الخ'' اور اگلی آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾﴾ ''تمہارے لیے بدلہ لینے میں زندگی (رکھ دی گئی) ہے اے عقل والو اگر تم سمجھتے ہو تو!'' قصاص کی سزاؤں کا تعین بھی خالق کائنات کی طرف سے ہے تاکہ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کا سدِباب ہو' البتہ اس کے نفاذ میں مظلوم کو اختیار حاصل ہے' چاہے تو قصاص لے کر انصاف کا بول بالا کرے یا پھر معاف کر کے صلہ رحمی کو فروغ دے۔ مگر اس ضمن میں جرائم کی روک تھام کو ممکنہ حد تک یقینی بنانے کے لیے مظلوم کے قصاص نہ لینے کے باوجود حکامِ وقت ظالم کو اپنی صوابدید پر سزا دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص قتل کرے اور مقتول کے ورثاء اس کو معاف کر دیں' جس کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد کا لوگوں کو نقصان پہنچانے پر دلیر ہو جانے کے امکانات موجود ہوتے ہیں' لہٰذا حکام قتل و غارت اور بدامنی کو ممکنہ حد تک روکنے کے لیے قاتل کو عمر بھر قید' جرمانہ یا پھر کوئی اور سزا تجویز کر سکتے ہیں۔ چونکہ رعایا کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہے' اس لیے خالق کائنات نے ریاست کو یہ اختیار عطا کیا ہے۔

تیسری قسم کی سزاؤں کو ''تعزیرات'' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ سزائیں ہیں جن کا واضح طور پر کوئی ذکر قرآن و حدیث میں موجود نہ ہو بلکہ اس کو حکام کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ حالات اور جرائم کی مناسبت سے یہ سزائیں ہلکی پھلکی بھی ہو سکتی ہیں اور سخت سے سخت بھی۔ اس ضمن میں حکام یا عدالت کو شریعت کی مقرر کردہ حدود اور اصولوں کے مطابق سزا جاری کرنے یا معاف کرنے کا

اختیار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ عام طور پر تمام سزاؤں کو ''تعزیرات'' کا نام دیا جاتا ہے' جیسے ''تعزیراتِ پاکستان'' اور ''تعزیراتِ ہند'' اس لیے چوہدری صاحب جیسے دانشور حضرات بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور حدود کو تعزیرات کے کھاتے میں ڈال کر خواہ مخواہ ایک نیا اجتہاد گھڑنے کی زحمت کرتے ہیں اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب ہم شرعی سزاؤں خصوصاً ''سرعام پھانسی'' کے بارے میں چوہدری صاحب کے موقف (فکری مغالطہ) کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ موقف صرف چوہدری صاحب کا نہیں بلکہ ملک کے تمام سیکولر و لبرل دانشوروں کا ہے' جو شرعی سزاؤں کی بحث چھڑنے پر اپنے بلوں سے نکل آتے ہیں' کہانیاں بناتے ہیں' افسانے گھڑتے ہیں' چہ میگوئیاں کرتے ہیں' پروگرامات کرتے ہیں' کالم لکھتے ہیں اور انسانی حقوق کے نام پر پیٹ کا جہنم بھرتے ہیں۔

چوہدری صاحب شرعی سزاؤں یعنی حدود کے بارے میں لکھتے ہیں: ''چور کے ہاتھ کاٹنا اور سنگسار کرنا بھی اہلِ یہود کا طریقہ تھا' یہ زنا کے مجرموں کو پتھر مار کر ہلاک کر دیتے تھے''۔ پھانسی کی سزا کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اسلام میں کسی جگہ پھانسی کی سزا موجود نہیں' پھانسی اور سرعام پھانسی اڑھائی ہزار سال قبل ایران سے شروع ہوئی تھی... ایران سے یورپ کے قبائل میں آئی... جرمینک اینگلو سیکسن قبیلے یہ سزا تیسری صدی عیسوی میں ایران سے برطانیہ لے کر آئے''۔ پھر لکھتے ہیں: ''ہم میں سے کس میں یہ جرأت ہے جو یہ بتائے کہ سزائے موت بنیادی طور پر اہلِ یہود کی سزا ہے' یہ قتل کے بدلے میں قتل کرتے تھے... صلیب رومنز کی سزا تھی... اور عربوں میں سرے سے پھانسی کی سزا موجود ہی نہیں تھی''۔

چوہدری صاحب یوں تو ہزاروں کتابیں اور دفاتر کا مطالعہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں' اور حسنِ ظن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ چوہدری صاحب وسیع المطالعہ شخص ہیں' لیکن کاش وہ شرعی سزاؤں' اُن کی کیفیت و کمیت' حکمتوں اور دوررس اثرات و نتائج کے بارے میں ایک آدھ گھنٹہ نکال کر کم از کم قرآن کا مطالعہ ہی کر لیتے تو انہیں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کی تاریخ' بے جا مفروضات اور غیر موزوں دلائل کا سہارا نہ لینا پڑتا' کیونکہ قرآن کریم کا بیان انتہائی سلیس' واضح اور دوٹوک ہے۔ شرعی حدود کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدۃ:۳۸) ''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں''۔

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ﴾ (النور:۲) ''زنا کرنے والی عورت ہو یا مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔'' ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً﴾ (النور:۴) ''جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کو اسّی کوڑے لگاؤ.....''۔ ''زنا کرنے والے شادی شدہ ہوں تو ان کو رجم (سنگسار) کیا جائے اور شراب پینے والوں پر کوڑے برسائے جائیں''۔ (اجماعِ صحابہ)۔ پھانسی کی سزا سے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ﴾ (المائدۃ:۳۳) ''جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ اُنہیں قتل کیا جائے' یا سولی پر لٹکا دیا جائے' یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں یا پھر علاقہ بدر کر دیے جائیں۔''

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ کسی چیز پر ''اسلامی'' کا ٹیگ ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ اُس کا ذکر قرآن پاک میں یا پھر احادیث و اجماعِ صحابہ میں کہیں موجود ہو' اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ قبل از اسلام کسی زمانے میں کسی کے ہاں مروّج رہا ہو یا نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ چوری پر ہاتھ کاٹنا' زنا پر کوڑے لگانا یا رجم و سنگسار کرنا یا پھانسی دینا وغیرہ فلاں زمانے میں فلاں لوگوں کے ہاں مروّج تھا اس لیے یہ اسلامی نہیں ہو سکتا' یہ واضح طور پر حق و باطل کی تمیز کو ختم کرنا اور سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے' جسے قرآن پاک نے یہودیوں کی بے شرمی اور قباحت کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اگر اسی مفروضے کو بنیاد بنا لیا جائے تو کل کوئی شخص یہ دعویٰ کرے گا کہ چونکہ نماز' روزہ' حج اور دیگر عبادات اسلام سے قبل اہلِ کتاب میں موجود تھیں' لہٰذا ان کو اسلامی کیسے کہا جا سکتا ہے! کیا یہ دعویٰ مضحکہ خیز نہیں ہے؟

سرِعام پھانسی اور اس کے اثرات و نتائج کے بارے میں چوہدری صاحب یوں رقمطراز ہیں: ''سرِعام پھانسی انسانیت سوز فعل تھا' لہٰذا یہ ۱۹۳۶ء میں امریکا اور ۱۹۶۴ء میں برطانیہ میں بند ہو گیا... دنیا سرِعام پھانسی کو بربریت اور غیر انسانی فعل سمجھتی ہے۔ ایک عوامی پھانسی کتنے لوگوں کو کتنے عرصے کے لیے بیمار کرتی ہے' یہ لوگوں کو کتنا اذیت پسند اور ڈپریس بنا دیتی ہے' تحقیق

کرنے پر آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔''

کتنے شرم کی بات ہے کہ کوئی مسلمان شخص اسلامی احکامات کو انسانیت سوز فعل قرار دے۔ کون نہیں جانتا کہ انسانیت کا سب سے بڑا اور حقیقی علمبردار اسلام ہے' جس نے انسانیت کو ایسی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر لا کھڑا کیا جس کی نظیر آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کیا اسلام نے انسانیت پر سب سے بڑا یہ احسان نہیں کیا کہ انسان کو ذلت اور پستی سے نکال کر ایک ایسا بلند مقام عطا کیا جس پر فرشتوں کو رشک آتا ہے۔ وہ انسان جو چاند' سورج' ہوا' آگ' پانی' مٹی' پتھر' درختوں' جانوروں' ستاروں یہاں تک کہ اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی بے جان مورتیوں کے آگے سجدہ ریز تھا' اُس انسان کو تسخیرِ کائنات کا شعور بخشا' اور جدید ترقی یافتہ مواصلاتی دور کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔ کیا اسلام نے انسانوں میں صدیوں سے قائم بے جا نسلی تفاخر اور امتیازات کو ختم نہیں کیا؟ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں بندہ اور بندہ نواز کی تفریق کو ختم کرنے والا سب سے بڑا داعی اسلام ہے!

انسانیت پر اسلام کے احسانات کا اگر اجمالی تبصرہ بھی کیا جائے تو کئی ضخیم دفاتر کم پڑ جائیں' لیکن ہمارے سیکولر و لبرل دانشور حضرات اُس انسانیت کی بات کرتے ہیں جسے مغرب نے ایک جدید مذہب کے طور پر تراش خراش کر پیش کیا' جس میں وہی اقدار قابلِ قبول ہیں جو اُن کے معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی مفادات کا تحفظ کرتی ہوں۔ کیا یہ وہی انسانیت کے علمبردار نہیں جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر جنگیں برپا کیں' کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور تا ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا حقیقی انسانیت وہ ہے جس کا دعویٰ قرآن مجید نے کیا ہے کہ کسی ایک شخص (چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم) کو بلا جرم قتل کرنا پوری انسانیت کو قتل کرنے اور کسی ایک شخص کو زندگی دینا (چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم) پوری انسانیت کو زندہ کرنے کے مترادف ہے (ملاحظہ ہو المائدۃ:۳۲)۔ لہٰذا اسلام اور قرآن مجید کا ہر حکم عین انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

البتہ جہاں تک سرِعام پھانسی یا دیگر سزاؤں کی تشہیر کا تعلق ہے تو علیم و حکیم ذات کو اس امر کا بخوبی ادراک تھا کہ چودہ سو سال بعد سیکولر اور لبرل دانشور شرعی سزاؤں کی سختی کو بنیاد بنا کر اپنے مغربی آقاؤں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اعتراض کریں گے' لہٰذا خالقِ کائنات نے اعتراضات کے سدِ باب کے لیے ارشاد فرمایا کہ ''سزا (کا مقصد) مجرموں کے لیے رسوائی ہے''

(المائدۃ: ۳۳) نہ کہ اس سے اُن کی عزّت وتکریم بجالانا مقصود ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:
﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۳۸﴾ (المائدۃ) ''یہ عبرت ناک سزا اُن کے کیے کے بدلے میں اُنہیں دی جاتی ہے (لہٰذا اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں) یہ سزا اللہ کی طرف سے ہے' اور اللہ خوب طاقتور اور حکیم ذات ہے۔'' اور تیسری جگہ ارشاد فرمایا:
﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَاۗىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۲﴾ (النور) ''ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے''۔ تاکہ بُرے لوگوں کے انجامِ بد کی تشہیر کے ذریعے برائی کو روکا جائے اور اس بات کو ذہن نشین کرایا جائے کہ ریاست مجموعی طور پر عوام کے جان و مال کے تحفظ کی خاطر ظالموں کے لیے ہمیشہ بے رحم ہوتی ہے' جبکہ سزا کی تشہیر کا دوسرا مقصد عبرت ہوتا ہے' جسے چوہدری صاحب نے ''ڈپریشن' بیماری اور اذیت'' سے تعبیر کیا ہے۔ عجیب مضحکہ خیز مفروضہ ہے' کیونکہ جو لوگ عبرت ناک کی تشہیر سے بیماری' اذیت اور ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں' شریعت نے قاضی یا حاکم کو اُن کی حاضری کے لیے دعوت نامہ بھیجنا لازمی تو نہیں قرار دیا' بلکہ شریعت نے صرف مسلمانوں کی ایک جماعت کی شرط لگائی ہے۔ جو لوگ بیماری اور ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں وہ عام عوام نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنہیں سیکولر اور لبرل کہا جاتا ہے' لہٰذا اُنہیں حاضر ہونے اور دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بڑے افسوس کی بات ہے کہ موصوف کو سیکولر اور لبرل حضرات کی اذیت اور ڈپریشن کا تو خیال ہے' لیکن جن بچوں کو زیادتی کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے' اُن والدین اور رشتہ داروں پر جو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے اُس کی بالکل فکر نہیں۔ وہ ماں جس کا کلیجہ چھلنی ہو جائے' دل پارہ پارہ ہو کر بکھر جائے' آنکھوں میں آنسو خشک ہو جائیں اور وہ جیتے جی مردہ لاش بن جائے' چوہدری صاحب کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

جاوید چوہدری بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے بعد قتل کرنے والے درندہ صفت لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ درست ہے بچوں کے ساتھ زیادتی ناقابلِ معافی جرم ہے۔ ہم بے شک ان مجرموں کو سزائے موت دیں' لیکن سرعام پھانسی کسی بھی صورت قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیے۔ بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے لوگ نارمل نہیں ہوتے' یہ ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے بیمار ہوتے ہیں' یہ پاگل' سنگ دل اور اذیت پسند ہوتے ہیں۔''

عجیب تماشا ہے کہ وہ لوگ جو معاشرے کے امن کو پامال کر دیں' زمین میں فساد برپا کریں'

بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر بے دردی سے قتل کر دیں' جن کو نشانِ عبرت بنانے کی ضرورت ہے' ازروئے ارشادِ ربانی: ﴿وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ﴾ (النور: ۲) ''ان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہ کھانا چاہیے' اگر تمہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو''۔ اُن کے لیے پھانسی پر متفق ہونے کے بعد انہیں ذہنی و نفسیاتی مریض' ابنارمل اور پاگل قرار دے کر عوام کو شرعی سزاؤں سے تدریجاً متنفر کرنے اور لوگوں کے دلوں میں ان درندوں کے لیے رحم پیدا کرنے کی کوشش ایک انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔

یہاں ایک انتہائی اہم اور بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ اُس شخص کو ذہنی و نفسیاتی مریض کس چیز نے بنایا؟ کس چیز نے اُسے پاگل کر دیا یہاں تک کہ اُس نے اپنی ہوس اور شہوت پوری کرنے کے لیے پھول کلیوں کو نشانہ بنا ڈالا۔ کیا ہمارے اخبارات کلچر اور شوبز کے نام پر جذبات کو برانگیختہ کرنے' صبح سویرے ذہن کو پراگندہ کرنے اور بے حیائی کے فروغ میں اپنا کردار ادا نہیں کر رہے؟ کیا ہمارے ٹی وی چینلز پر چلنے والے ڈراموں نے ہمارے نوجوان مرد و زن کی نس نس میں بے حیائی' فحاشی و عریانی کو کُوٹ کُوٹ کر نہیں بھرا؟ کیا ٹی وی چینلز پر چلنے والے بے ہودہ اشتہارات نے رشتوں کا تقدس پیروں تلے نہیں روندا؟ کیا جدید تہذیب کے نام پر عورت کو سر کے بالوں سے لے کر پیر کے ناخنوں تک مارکیٹ میں نہیں بیچا؟ کیا عصری تعلیمی اداروں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مخلوط نظامِ تعلیم اور بڑھتی ہوئی بے راہ روی نے نوجوان نسل کی زندگیوں کو برباد نہیں کیا؟ یہی وہ چیزیں ہیں جو پہلے تو ایک نارمل شخص کو ذہنی و نفسیاتی مریض بناتی ہیں اور بعد میں پاگل کر دیتی ہیں' یہاں تک کہ اُس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے' آنکھوں پر پٹی اور عقل پر دبیز پردے پڑ جاتے ہیں' سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مسلوب ہو جاتی ہیں اور وہ ایسے گھناؤنے جرائم کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ کیا کسی سیکولر و لبرل دانشور میں جرأت ہے جو اس کے خلاف آواز اُٹھائے؟؟؟

جن ممالک میں سرعام پھانسی کی سزا دی جاتی ہے اُن کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں: ''ایران' صومالیہ' سعودی عرب اور شمالی کوریا میں مسلسل سرعام سزائے موت دی جا رہی ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہاں یہ جرائم رک گئے ہیں؟ جی نہیں! اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان چاروں ملکوں میں سرعام سزائے موت کے باوجود جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے' جبکہ

ان کے مقابلے میں جاپان اور سنگاپور میں سرے سے سزائے موت نہیں، لیکن اس کے باوجود جاپان میں سالانہ گیارہ اور سنگاپور میں صرف دس افراد قتل ہوتے ہیں۔ چنانچہ حکومت کو یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ صرف سزاؤں سے جرم نہیں رکتے۔ ریاست کا کام صرف سزا دینا نہیں بلکہ جرائم کو بھی روکنا ہے۔ سزاؤں کی زیادتی اکثر اوقات جرائم میں اضافہ کر دیتی ہے۔ سعودی عرب میں ہر جمعہ کے دن سر اتارے جاتے ہیں، لیکن منشیات فروش اس کے باوجود وہاں منشیات بھی بیچ رہے ہیں اور قاتل قتل بھی کر رہے ہیں۔ کیوں؟ کیوں کہ وہاں صرف سزائیں دی جا رہی ہیں، جرم نہیں روکا جا رہا۔''

اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ ریاست کی ذمہ داری صرف سزائیں دینا نہیں بلکہ جرائم کو روکنا بھی ہے، تاہم شرعی سزاؤں کا اجراء اور تشہیر قتل و غارت، جرائم اور فساد کی روک تھام کے لیے کیے جانے والے اقدامات میں سے ہے جس کی اہمیت و افادیت سے فقط سطحی مفروضات اور ڈھکوسلوں کی بنیاد پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ممکنہ حد تک فساد فی الارض پر قابو پانے کے لیے حکومتی سطح پر دیگر اقدامات بھی انتہائی ضروری ہیں، جس کا کافی حد تک پاکستان سمیت ایران، سعودی عرب، شمالی کوریا اور صومالیہ میں بھی فقدان ہے، لیکن اس کے باوجود دیگر ممالک کے ساتھ اگر اعداد و شمار کی روشنی میں موازنہ کیا جائے تو فقط دو تین سزاؤں کے اجراء کی برکت سے نتائج انتہائی مختلف ہوں گے۔ البتہ جاپان اور سنگاپور میں دیگر عوامل و محرکات کو نظر انداز کر کے قتل کی شرح کا انتہائی حد تک کم ہونے کو فقط سزائے موت کے نہ ہونے کی طرف منسوب کرنا غلط بیانی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ موصوف طالبان کے دورِ حکومت امارتِ اسلامیہ میں منشیات و جرائم کے اعداد و شمار ذکر کرنا بھول گئے ہیں جہاں جرائم عنقا اور منشیات ناپید ہو گئے تھے۔ تاہم کُلّی طور برائی کا سدِّ باب ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ جب تک اس کرۂ ارض پر انسان موجود ہیں، خیر و شر کی یہ کشمکش جاری رہے گی۔ کیا کسی سیکولر و لبرل دانشور میں اتنی جرأت ہے کہ اپنے موقف پر نظر ثانی کر کے رجوع کرے؟

رحمتِ ربّانی کی وسعت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس انداز سے پیدا کیا کہ اُنہیں نیکی اور برائی کرنے کا اختیار دیا اور اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ہدایت اور گمراہی کو واضح کر دیا۔ البتہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، وہ تو ہمیشہ اسی طاق میں رہتا ہے کہ وہ انسانوں کو گناہوں پر آمادہ کرتا رہے۔ اکثر لوگ اُس کے مکر و فریب میں آ کر گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ چونکہ دنیا کی زندگی میں طرح طرح کی کشش موجود ہے اور آخرت کی زندگی نظر نہیں آتی، لہٰذا انسان آسانی سے دنیا کی زیب و زینت سے متأثر ہو کر گناہوں کا ارتکاب کر لیتا ہے۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے، یہ دنیاوی کشش کے سامنے استقامت کا مظاہرہ کم ہی کر پاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ رعایت دی ہے کہ جو شخص گناہ کر کے توبہ کر لے، یعنی گناہ پر ندامت محسوس کرے اور آئندہ اس گناہ کے ارتکاب سے باز رہنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اللہ کے حضور اپنے گناہ کی معافی چاہے تو اللہ تعالیٰ اُس کا گناہ معاف کر دیتا ہے، بلکہ انسان کے اس رویّے سے تو وہ خوش بھی ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

> ''تم میں سے کوئی بیابان میں اپنے گم شدہ اونٹ کو پا کر جتنا خوش ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اپنے بندہ کی توبہ پر خوش ہوتے ہیں۔'' (صحیحین)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے، اُس کی رحمت کو تو بہانہ چاہیے کہ بندہ اس کے سامنے اپنے گناہوں پر نادم ہو اور اُس سے بخشش مانگے۔ بس اُسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اُسی کو بخشنہار سمجھے۔ جامع ترمذی میں حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے ابنِ آدم! جب تک تو مجھے پکارے گا اور مجھ سے اُمید رکھے گا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا، چاہے

تیرے اعمال جیسے بھی ہوئے اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اے ابنِ آدم! چاہے تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک جا پہنچیں اور پھر تو مجھ سے بخشش مانگے تو میں تیری بخشش کروں گا۔ اے ابنِ آدم! چاہے تو میرے پاس زمین بھر خطاؤں کے ساتھ آئے، بشرطیکہ تو نے شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس اتنی ہی مغفرت کے ساتھ آؤں گا۔'' (بحوالہ اربعین نوویؒ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اُمت سے بھول کر ہو جانے والے گناہ اور حالت اضطراری میں کی جانے والی غلطی کو ویسے ہی معاف کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری خاطر میری اُمت سے بھول چوک معاف کر دی اور وہ چیز بھی جس پر اُس کو مجبور کر دیا گیا ہو''۔ (ابن ماجہ، بیہقی بحوالہ اربعین نوویؒ)

خدائے رحیم و کریم اپنے بندے کے خلوص پر مبنی ہر عمل پر اپنی شان کے مطابق اجر دیتا ہے۔ خاص طور پر جو بندہ توحید پر پختہ یقین رکھتا ہو اور ہر طرح کی اُمید اُسی خدائے واحد سے رکھے، اپنے گناہوں اور خطاؤں پر نظر رکھتے ہوئے اُسی سے بخشش کی استدعا کرے اور گڑگڑا کر اُسی کے سامنے گریہ زاری کرے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کے ڈر سے رونے والا جہنم میں نہیں جائے گا جب تک کہ دودھ تھنوں میں واپس نہ چلا جائے۔'' (جامع ترمذی، بحوالہ ریاض الصالحین)

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ہر صفت لامحدود ہے اسی طرح اُس کی صفتِ رحمت بھی لامحدود ہے، بلکہ اُس کی رحمت تو ہر چیز پر حاوی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف: ۱۵۶) پس اللہ کی رحمت کے سایہ میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے نادم ہو، استغفار کرے اور پھر آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کرے۔ اسی کو توبہ کہتے ہیں۔ توبہ کی فضیلت قرآن و حدیث میں جابجا مذکور ہے۔ گناہوں سے توبہ کرنے والے کے پچھلے تمام گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، حتیٰ کہ کسی گناہگار کو جب وہ گناہ سے توبہ کر چکا ہو اُس کی گناہوں کی زندگی پر شرمندہ کرنے اور طعنہ دینے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اپنے گناہگار بندوں کو حوصلہ دلاتا ہے کہ گناہوں کی آلودگی پر مایوس نہ ہوں بلکہ ربِّ غفور سے گناہوں کی معافی چاہیں تو اُن کے گناہ بخش دیے جائیں

گے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵۳﴾ (الزمر)

''(اے پیغمبر ﷺ!) کہہ دیجیے! اے میرے وہ بندو جنھوں نے (گناہوں کا ارتکاب کر کے) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ گناہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

انسان خطا کا پتلا ہے، وہ گناہ سے لاکھ بچے اور تقویٰ کی روش اختیار کرے، گناہ اُس سے ضرور سرزد ہو جائے گا۔ انسان کی اسی فطری کمزوری کی بنا پر اُسے یہ آسانی دی گئی ہے کہ صدورِ گناہ کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائے اور بخشش چاہے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کہتا ہے کہ اگر وہ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہیں گے تو اُن کے چھوٹے چھوٹے گناہ بخش دیے جائیں گے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱﴾ (النساء)

''اگر تم بچتے رہو گے بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو روکا گیا ہے تو ہم تم سے تمہاری برائیوں کو مٹا دیں گے اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام پر (یعنی جنت میں)۔''

اسی مضمون کو سورۃ النجم میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ﴾ (آیت ۳۲)

''جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بے حیائی سے بھی، سوائے معمولی گناہوں کے۔ بے شک تیرا پروردگار وسیع مغفرت والا ہے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا گناہ سے توبہ کرنا اور اپنے ماضی کے گناہوں پر شرمندہ ہو کر آئندہ نیکی کے کاموں میں لگ جانا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ حتیٰ کہ ایک جگہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گناہوں سے سچی توبہ کرنے والے کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیا جاتا

ہے۔ دیکھئے سورۃ الفرقان:

﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۰﴾﴾

''سوائے اُن کے جنہوں نے توبہ کر لی (گناہوں سے) اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے' پس ایسے ہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

اسی طرح اگر بتقاضائے بشریت کسی سے کوئی گناہ کا کام ہو جائے تو (اُس کی تاثیر کو مٹانے کے لیے) نیکی کا کام کرے۔ ایسا کرنے سے اُس کا گناہ بخش دیا جائے گا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرو' وہ نیکی اس گناہ کو مٹا دے گی''۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو گیا' جب اسے تنبہ ہوا تو بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اپنا حال بیان کیا اور عرض کی مجھے سزا دیجیے تاکہ میں آخرت کی سزا سے بچ جاؤں۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کو جواب نہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود:۱۱۴) ''اور قائم کرو نماز دن کے دونوں طرف اور رات کے کچھ حصے میں۔ بے شک نیکیاں دور کر دیتی ہیں برائیوں کو''۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت سنائی تو اس شخص نے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا یہ قانون صرف میرے لیے ہے؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''یہ میری ساری اُمت کے لیے ہے۔'' (بخاری و مسلم)

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں جو صحیحین میں موجود ہے کہ ایک شخص رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا ہے' مجھ پر سزا لاگو کیجیے۔ یہ سن کر آپؐ نے اسے کوئی جواب نہ دیا کہ اُسی وقت نماز کھڑی ہو گئی۔ سب نے نماز پڑھی اور اُس شخص نے بھی آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر اُس نے پھر وہی بات دہرائی کہ یارسول اللہ! میں نے سزا ملنے والا کام کر لیا ہے' لہٰذا مجھ پر سزا قائم کیجیے جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟'' اس نے عرض کیا جی ہاں پڑھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''بس تو اللہ نے تیرا گناہ

معاف کر دیا۔''

معلوم ہوا کہ ربِّ غفور نیکیوں کے سبب سے لوگوں کے گناہ بخش دیتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ گناہ کے بعد شرمندگی کے احساس کے ساتھ بندہ پروردگار کے سامنے جھک جائے اور گڑگڑا کر معافی کا خواستگار ہو' جیسا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے:

﴿وَاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۰۶﴾﴾ (النساء)

''اور اللہ سے استغفار کرو' بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں دیکھئے:

﴿وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾﴾

''اور اللہ سے بخشش مانگو' بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

خالقِ کائنات نے نیک کاموں کی ترغیب دی ہے اور برائیوں سے روکا ہے اور سزا کی وعید سنائی ہے۔ تاہم اُس کا رجحان سزا دینے کی بجائے بخش دینے کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ نیکیوں کو زیادہ کر کے شمار کرتا ہے جبکہ گناہوں کو کم کر کے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾﴾ (الانعام)

''جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اُس کے لیے اس کا دس گنا (اجر) ہے' اور جو کوئی لاتا ہے ایک برائی تو سزا پائے گا اُس کے برابر' اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔''

یعنی نیکی کرنے والے کو ہر نیکی کا اجر دس گنا دیا جائے گا جبکہ ایک برائی کو ایک ہی تصور کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ واسعہ کا مظہر ہے' بلکہ ایک طویل حدیث سے اسی آیت کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں (الگ الگ) لکھ دیں اور پھر اس بات کو واضح کر دیا۔ پس جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور وہ اسے کر نہ پایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے لکھ لیا اپنے پاس ایک کامل نیکی۔ اور اگر اس کا قصد کیا اور کر بھی پایا تو اللہ اُسے لکھ لیتا ہے اپنے پاس دس نیکیوں سے سات سو گنا نیکیوں تک' بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ تک۔ اور اگر کسی شخص نے برائی کا قصد کیا' پھر اسے نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے

پاس لکھ لیا ایک نیکی پوری۔ اور اگر برائی کا ارادہ کیا اور اسے کر بھی لیا تو اللہ نے لکھا اسے ایک برائی۔'' (یہ حدیث قدسی ہے اور بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔)

قرآن شریف کی آیت ﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ﴾ کا بھرپور مظاہرہ اس حدیث صحیح میں نظر آ رہا ہے۔ نیکی کا محض ارادہ بھی ایک نیکی شمار کیا جاتا ہے جبکہ گناہ کے ارادے پر گناہ شمار نہیں ہوتا۔ البتہ جب انسان گناہ کا ارتکاب کر ہی لے تو اس کے حساب میں ایک گناہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس نیکی کر لینے کی صورت میں کم از کم دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ کا کوئی شمار ہی نہیں' کیونکہ سات سو کے بعد بھی کئی گنا زیادہ کے الفاظ حدیث میں آئے ہیں۔ یہ انسان کے خلوص اور اخلاص پر مبنی ہے کہ اُسے کس حد تک ثواب دیا جاتا ہے۔ بہرحال کم سے کم ثواب تو ہر نیکی کا دس گنا ہے ہی' جیسا کہ اوپر سورۃ الانعام کی آیت ۱۶۰ میں وارد ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ رویہ ''مائل بہ کرم'' کا ہے۔ وہ نہ صرف اچھے قصد و ارادوں پر پورا ثواب عطا کرتا ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے اور آسان سے کاموں پر اس نے گناہوں کی بخشش کی نوید سنائی ہے اور بڑے بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے حضور اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ

(۱) مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نماز کے برابر ہے۔

(۲) جو شخص حج یا عمرہ یا جہاد کے لیے نکلا پھر راستے میں اُسے موت نے آ لیا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ مجاہد' حاجی اور عمرہ کرنے والوں کا ثواب لکھ دے گا۔ یہی بات قرآن حکیم میں بھی وارد ہے:

﴿وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (النساء:۱۰۰)

''اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف ہجرت کے لیے نکل جائے پھر اس کو موت آ جائے تو اللہ کے ذمہ اُس کا ثواب واقع ہو گیا۔''

(۳) جو شخص تہجد کی نماز پڑھنے کی نیت سے سویا اور پھر آنکھ نہ کھل سکی تو اسے تہجد پڑھنے کا ثواب ملے گا۔

(۴) جس شخص نے نماز عشاء باجماعت پڑھی گویا اُس نے آدھی رات نماز میں قیام کیا اور جس

نے صبح کی نماز بھی جماعت سے ادا کر لی تو گویا وہ ساری رات نماز کی حالت میں رہا۔

(۵) جب کوئی شخص وضو کرتا ہے تو جو اعضاء وہ دھوتا ہے اُن کے گناہ ساتھ دھلتے جاتے ہیں۔

(۶) جب کوئی شخص نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف جاتا ہے تو اُسے ہر قدم پر نیکی کا ثواب ملتا ہے اور نماز باجماعت کا ثواب الگ ملتا ہے۔

(۷) جو بھی مسلمان کوئی پودا لگائے یا کھیتی بوئے' پھر کوئی انسان یا پرندہ یا چوپایہ اُس میں سے کھا لے تو وہ اس کے لیے صدقہ شمار ہوگا۔ پھر اگر اُس کی کھیتی میں سے کچھ پیداوار چوری ہو جائے تو وہ بھی صدقہ سمجھی جائے گی۔

(۸) ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والی اولاد اپنے والدین کی طرف ایک مرتبہ رحمت کی نظر سے دیکھے تو اس کے لیے ہر نظر کے بدلے اللہ تعالیٰ ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیں گے۔ جب آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہؓ نے سوال کیا: اگرچہ روزانہ سو مرتبہ نظر ڈالے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں' اللہ بہت بڑا ہے اور (ہر نقصان سے) پاک ہے۔ یعنی اتنا زیادہ ثواب عطا فرمانا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں۔

(۹) جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے مہینے میں چھ روزے رکھ لیے تو اس کو پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا۔ اور اگر ہمیشہ ہی ایسا کر لیا کرے تو گویا اس نے ساری عمر روزے رکھے۔

(۱۰) جو بندۂ مؤمن صبح و شام تین مرتبہ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا پڑھ لیا کرے تو اللہ کے ذمہ ہے اس کو قیامت کے دن راضی کرے۔

(۱۱) جو شخص فجر کی نماز باجماعت پڑھ کر اسی جگہ بیٹھا رہے اور سورج نکلنے تک اللہ کے ذکر میں مشغول رہے اور بعد ازاں دو رکعت نماز پڑھ لے تو اس کو پورے حج اور عمرے کا ثواب ملے گا۔

(۱۲) جس کسی نے دوسرے شخص کو ترغیب دے کر کسی نیک کام پر لگا دیا تو اُس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا خود نیک عمل کرنے والے کو۔

(۱۳) ایک نماز سے دوسری نماز تک جو گناہ ہو جائیں وہ نماز پڑھنے سے معاف ہو جاتے ہیں۔

(۱۴) ۹ ذوالحجہ کو روزہ رکھنے سے ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عاشورہ کا روزہ پچھلے سال بھر کے گناہوں کی بخشش کا باعث بن

جاتا ہے۔

(۱۵) جو شخص مؤذن کے ادا کیے ہوئے الفاظ کا جواب دے اس کے لیے جنت ہے۔

(۱۶) جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے، پھر اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پڑھے تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ جس دروازہ سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

(۱۷) فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والے شخص اور جنت کے درمیان صرف موت حائل ہے۔ یعنی اسے مرتے ہی جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

(۱۸) مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر کسی سے گفتگو کرنے سے پہلے سات مرتبہ ''اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ'' پڑھنے والا رات کو مر جائے تو دوزخ میں نہ جائے گا اور فجر کی نماز سے فارغ ہو کر کسی سے گفتگو کرنے سے پہلے سات مرتبہ یہی الفاظ پڑھ لے تو اگر اس دن فوت ہو جائے تو دوزخ میں نہ جائے گا۔

(۱۹) جو شخص سرورِ عالم ﷺ پر ایک مرتبہ درود پڑھے تو اُس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، دس گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور دس درجے بلند کر دیے جاتے ہیں۔

(۲۰) قرآن پاک کی تلاوت پر ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں، اس طرح کہ الم کو تین حروف شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الاخلاص تین بار پڑھ لینے سے پورا قرآن پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

(۲۱) ماہِ رمضان میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر گنا دیا جاتا ہے۔

(۲۲) اگر بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ پڑھ کر کھانا کھائے اور کھا کر یہ پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هُوَ اَشْبَعَنَا وَاَرْوَانَا وَاَنْعَمَ عَلَيْنَا وَاَفْضَلَ تو اس سے اس کھانے کا حساب نہ ہوگا۔

الغرض قرآن و حدیث میں تھوڑے عمل پر بڑے بڑے ثواب اور گناہوں کے بعد ندامت کے احساس اور استغفار پر گناہوں کی بخشش کے علاوہ دخولِ جنت اور درجات کی بلندی کی نوید سنائی گئی ہے۔ بندۂ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے ان خزانوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

البتہ یہ بات ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس رحمتِ واسعہ اور مائل بہ کرم

ہونے کی صفت سے مستفید ہونے کے لیے صرف ایک شرط ہے، جو انتہائی حقیقی، معقول، مناسب اور ضروری ہے، اور وہ یہ کہ غفورٌ رحیم اللہ تعالیٰ کی معرفت کے تحت اس کی ذات و صفات اور صفات کے تقاضوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان تمام آسانیوں، رحمتوں اور بخششوں سے محرومی انسان کا مقدر بن جائے گی۔ اس بات کو دوٹوک انداز میں ایک سے زائد مرتبہ قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾ (النساء)

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ ہر چیز بخش دے گا جس کے لیے چاہے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ تو دُور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

بس یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شرک اس قدر بڑا جرم ہے کہ غفورٌ رحیم اور وسیع الرحمت خدا کے ہاں بھی قابلِ معافی نہیں۔ چنانچہ اس عقیدے کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی کثیر تعداد میں انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کیے گئے، جن کی تعلیم کا نقطۂ آغاز لا اِلٰہ الّا اللہ ہوتا تھا۔ یعنی عبادت صرف اُسی اللہ کی ہے جو ذات وصفات میں یکتا و تنہا ہے۔ صرف وہ ایک ہی خالق ہے، باقی ہر جاندار اور بے جان اُس کی مخلوق ہے۔ مخلوق کے کسی فرد کے پاس جو بھی قابلِ تعریف خوبی یا صفت ہے وہ اُسی کی عطا کردہ ہے، وہ جب چاہے چھین سکتا ہے۔ موت و حیات، صحت و بیماری، رزق کی تنگی و کشادگی، اولاد کا عطیہ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُس میں کوئی کمزوری (weakness) نہیں، جبکہ مخلوق کا کوئی فرد کمزوری کے بغیر نہیں۔ یوں مخلوق کی ہر شے اور ہر فرد اُس کا محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، وہ اپنے بندوں سے انتہائی قریب ہے اور ہر ایک کی دعا سنتا ہے مگر اُس پر مخلوق کا کوئی فرد اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اُسے نظامِ عالم چلانے کے لیے کسی کے مشورے اور راہنمائی کی ضرورت نہیں۔ وہ خود جو چاہے کرتا ہے۔ یقیناً انبیاءؑ اُس کی اکرم اور اشرف مخلوق ہیں، مگر وہ بھی زندگی بھر اُسی سے دعائیں مانگتے، اُسی کے سامنے گڑگڑاتے اور اسی کے آگے سجدہ ریز ہوتے رہے اور لوگوں کو اسی کی عبادت کی تلقین کرتے رہے۔

Apr 2020
Vol.69

Regd. CPL No.115
No.4

Monthly **Meesaq** Lahore

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے ۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے !

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 600 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 350 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501
maktaba@tanzeem.org